نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ

ہفت روزہ

نصرت

لاہور

۱۷

اتوار: ۱۹ جنوری ۱۹۶۹ء

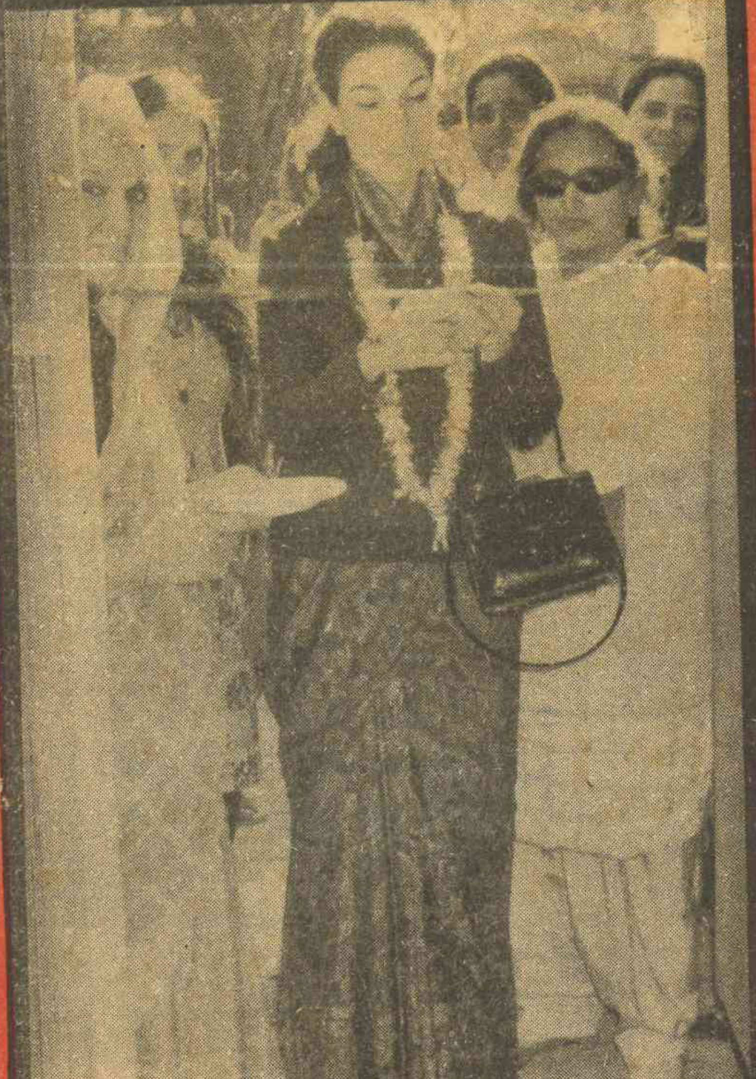

بیگم نصرت بھٹو

لاہور میں پیپلز پارٹی (خواتین) کے دفتر کا افتتاح

مدیر: محمد حنیف رامے

۳۰ پیسے

شہزاد احمد

غزل

اس دورِ بے دلی میں کوئی بات کیسے ہو
چاہیں بھی ہم تو خود سے ملاقات کیسے ہو
کاٹے نہیں گئے تو مرے ہات کیسے ہو
میرے نہیں ہو تم تو مرے سات کیسے ہو
پتھر برس رہے ہیں تو مجھ پر بھی آئیں گے
میں چُپ رہوں مگر بسر اوقات کیسے ہو
کچھ دیکھتے نہیں ہو تو بینا ہو کس طرح
ٹھنڈے پڑے ہوئے ہو تو جذبات کیسے ہو
تم قیدیوں کی طرح مرے دل میں ہو اسیر
پھیلے نہیں جہاں میں، خیالات کیسے ہو
اس روشنی میں چہرہ چھپاؤ گے کب تلک
تم مانگتے ہو رات مگر رات کیسے ہو
سورج نہ چاہتا ہو تو دن کس طرح ڈھلے
بادل ہی رُوٹھ جائیں تو برسات کیسے ہو
وہ چاہتے ہیں ان کے لیے میں دعا کروں
شامل اس آرزو میں مری ذات کیسے ہو
بندے کا اور خدا کا تعلق ہی مٹ چکا
پتھر ہوئی زبان مناجات کیسے ہو
ایسا کوئی جو میری زباں بھی سمجھ سکے
تم اجنبی ہو تم سے مری بات کیسے ہو
میں اپنے دشمنوں کو بھی پہچانتا نہیں
شہزادؔ دوستوں سے ملاقات کیسے ہو

امجد اسلام امجد

ہاں وہی شوق کی بات

ہاں چلے اہلِ جنوں
پھر وہی طوق کی بات
قصۂ بند و قفس
سلسلۂ شوق کی بات
منتظر آنکھ میں سمٹی ہوئی حیرت کو ہے
اپنے خوابوں سے نجات
ہونٹ کی مُہر کھلے، چُپ کے ستارے ٹوٹیں
اور تمنّا کے گلاب
قریۂ ضبط کی مٹی سے مہکتے پھوٹیں
تیشۂ دستِ نوا
سینۂ شب میں اُترے
سرد تاریک اندھیروں میں بھٹکتا سورج
بیشۂ غم سے رہائی پائے
شمعِ آواز جلے
اور کٹے
صبح کی راہ میں ٹھہرا ہوا کوہِ ظلمات
ہاں چلے اہلِ جنوں
تیشۂ دستِ نوا، طوق کی بات
ہاں وہی بند و قفس، شوق کی بات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

پاک چین دوستی کے پہاڑ پر ایک نیا بادل

پاک چین دوستی کے متعلق ایک چینی شاعر نے اچھا کہا تھا، یہ پہاڑ کے مانند ہے جس کے اوپر سے حالات کے نت نئے بادل گذرتے رہتے ہیں لیکن پہاڑ اپنی جگہ اٹل رہتا ہے۔ آج کل اس پہاڑ پر سے جو بادل گذر رہے ہیں ان میں امریکہ اور روس کے اُس دباؤ کے بادل تو شامل ہیں ہی جو اُن کی برصغیر پاک و ہند میں اپنی مخصوص بھارت نواز پالیسی کے تحت پاکستان پر سایہ فگن ہیں لیکن ایک بادل ایسا بھی ہے جو خود ہمارے اپنے ساحلوں سے اُٹھا ہے۔ یقیناً یہ سب بادل اُسی طرح چھٹ جائیں گے جیسا کہ سب بادلوں کا مقدر ہے۔ لیکن یہ آخری بادل ایسا ہے جس میں بڑی خوفناک بجلیاں پوشیدہ ہیں۔ اس بادل کی بجلیاں اس لیے خوفناک ہیں کہ یہ بادل ہماری اپنی صفوں سے اُٹھا ہے تاکہ ہماری دوستی کے اس پہاڑ کو دُھنکی ہوئی روئی بنا کر رکھ دے۔ "بد اعتمادی کی آگ لگانے کے لیے گھر کا یہ چراغ ہمارے انہی بھائیوں نے جلایا ہے جو کبھی تحریک پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مسلمانوں کی جُداگانہ قومیت کی بنیادیں ڈھانے اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت کے بارے میں بدظنی پھیلانے میں لگے تھے اور آج اسلام کے نام پر بدترین سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ میں کوشاں ہیں۔"

آج ہمارے کرمفرماؤں کو یہ درد اُٹھا ہے کہ چینی مسلمانوں کے ساتھ عوامی جمہوریہ چین میں بہت بُرا سلوک ہو رہا ہے اور یہ بات پاک چین دوستی کی جڑ کاٹ دیتی ہے کہ ہم تو چین اور اُس کے قائد کی اتنی قدر افزائی کریں اور وہاں وہ ہمارے دینی بھائیوں کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیں۔

جون ۱۹۶۸ء کے ترجمان القرآن کا اداریہ اس درد کی ٹیسوں سے اَٹا پڑا ہے۔ اِن ٹیسوں کی بنیاد جماعت اسلامی کے انگریزی جریدے (CRITERION) کا وہ مقالہ ہے جو شکاگو یونیورسٹی کے چینی نژاد مسلمان لیکچرر حاجی یوسف چانگ نے ۱۹۶۷ء میں سائراکیوز یونیورسٹی کے ایک مذاکرے میں پڑھا تھا۔ ترجمان القرآن میں جتنے اعداد و شمار دیے گئے ہیں وہ تمام تر اسی مقالے سے حرف بحرف ماخوذ ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اُردو ترجمان نے اپنی مرضی کی باتیں تو اخذ کر لی ہیں اور اُس تجزیے سے صاف آنکھ بچا لی ہے جو یوسف چانگ کے منافقانہ مضمون میں اور خود جماعت کے اپنے ہی انگریزی ترجمان کے صفحوں پر بکھرا ہوا ہے۔

یوسف چانگ کا پورا زور اس بات پر خرچ ہوا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین میں مسلمانوں کے ساتھ، دوسری مذہبی اقلیتوں کے مقابلے میں بہت اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ البتہ وہ اس خطرے میں مبتلا ہے کہ آئندہ ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ یہ اچھا سلوک بدسلوکی میں بدل جائے۔ جو چیز ایک امکان ہے اُسے ترجمان القرآن کے مدیر محترم کے پُرزور تخیل نے ایک واقعہ بنا کر پیش کر دیا ہے اور اس پر نوحہ گری شروع کر دی ہے۔

مدیر محترم لکھتے ہیں:۔

> "آغاز میں تو مسلمانوں نے اسے محسوس نہ کیا اور اشتراکیت کو بیرونی استعمار اور گھر کی سرمایہ داری و جاگیرداری سے نجات کی ایک وقتی تدبیر سمجھ کر اس کا ساتھ دیا لیکن اب جبکہ ماؤ کے خیالات اور اُس کی ذات کو پوری طرح لوگوں کے ذہنوں پر مسلط کیا جا رہا ہے اور وہ اس بات پر مجبور کر دیے گئے ہیں کہ اگر انھیں اشتراکی چین میں رہنا ہے تو ماؤ کے پرستار اور مومن بن کر رہیں، ان حالات میں دُنیا انھیں تنگ ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ماحول نے انھیں اتنا بے بس کر دیا ہے کہ ان کے لیے نجات کی اب کوئی راہ باقی نہیں رہی۔"

اب ذرا حاجی یوسف چانگ کا بیان ملاحظہ فرمایئے: وہ ایڈگر سنو کے حوالے سے ماؤزے تنگ کے مندرجہ ذیل وعدوں کا ذکر کرتے ہیں جو چیئرمین نے شمال مغربی چین کے مسلمانوں سے کیے تھے۔

۱۔ ایک خودمختار مسلمان ریاست کے قیام میں مدد دی جائے گی۔
۲۔ مسلم ثقافت کا تحفظ کیا جائے گا۔
۳۔ مذہبی آزادی دی جائے گی۔
۴۔ چینی مسلمانوں اور منگولیا، سنکیانگ اور سوویٹ روس کے مسلمانوں کے استحکام میں مدد دی جائے گی۔

ان وعدوں کو گنوانے کے بعد چانگ صاحب فرماتے ہیں:

"اسلام چونکہ مسلمان دُنیا کا پس منظر رکھتا ہے اور عیسائیت کا مضبوط رقیب ہے اور کبھی سازشی تنظیموں سے آلودہ نہیں رہا اس لیے یہ وہ واحد مذہب ہے جس کے بارے میں پیکنگ کے حکمران زبردست خواہش رکھتے ہیں کہ وہ ایشیاء کی انقلابی فتح کے پروگرام میں ان کی

مدد کرے۔ یہی وجہ ہے کہ چین کے اشتراکی مسلمانوں کو، بدھوں اور عیسائیوں کی نسبت، زیادہ آزادی دیتے ہیں۔ مثال یہ ہے کہ جب زرعی اصلاحات نافذ ہوئیں تو اس امر کی اجازت دے دی گئی کہ مسجدوں کے ساتھ جو وقف زمینیں ہیں وہ انھی سے منسلک رہیں۔ پھر مسلمانوں کی رسوم و روایات کا قانونی طور پر تحفظ کیا گیا ہے۔ اشتراکیوں نے چین کی متعدد مشہور مسجدوں کی مرمت بھی کرائی ہے بلکہ سُرخ افسروں نے قرآن مجید کی نشر و اشاعت میں بھی مدد دی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں پیکنگ میں چائنا اسلامک ایسوسی ایشن بھی قائم ہو چکی ہے۔ چین ہر سال مکہ مکرمہ میں حج کے وفود بھی بھیجتا ہے۔"

لیکن اچانک حاجی یوسف چانگ کو خیال آتا ہے کہ جو کچھ وہ فرما رہے ہیں وہ امریکہ میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔ لہٰذا انھوں نے "نیوز ویک" جیسے سنسنی زدہ ہفت روزے کی اس شہادت پر تکیہ کر کے کہ کلچرل ریوولیوشن کے دوران ریڈ گارڈز پیکنگ کی ایک مسجد سے ایک نکھٹو چینی مولوی صاحب کو باہر گھسیٹ لائے تھے یہ فتویٰ صادر کر دیا ہے کہ اب چین میں حالات بدل گئے ہیں اور ثقافتی انقلاب کے اختتام پر پتا چلے گا کہ مسلمان باقی بچتے ہیں یا نہیں۔ چانگ صاحب نے ایک کمال اور بھی کیا ہے کہ پورے چین کی مسلمان آبادی کو دو کروڑ سے تین کروڑ نفوس پر مشتمل قرار دے کر اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ اب یہ آبادی ایک کروڑ رہ گئی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یوسف چانگ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ چینیوں کے جس بیان کو وہ لے اُڑے ہیں وہ سرحدی مسلمان قبائل سے مخصوص ہے اور چینی ہمیشہ سے اپنی آبادی کو مذہب کی بنیاد پر نہیں نسلی بنیادوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ سرحد کے قریب جو پچاس قبائل آباد ہیں ان میں سے دس ایسے ہیں جو مسلم اکثریت کے حامل ہیں۔ ان دس قبائل کی آبادی ایک کروڑ ہے۔ اب چانگ صاحب نے جلدی میں یہ سمجھ لیا ہے کہ چینیوں نے خود چونکہ صرف ایک کروڑ مسلمان آبادی کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے باقی کے کروڑوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا ہے۔

دیکھنے والی بات اور ہے۔ حاجی یوسف چانگ صاحب ہوں یا ترجمان القرآن کے مدیر صاحب، آخر ان صاحبوں کو تکلیف کیا ہے؟ تکلیف یہ ہے کہ چینی مسلمانوں نے سوشلزم کے پیغام کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے اور چینی حکومت نے مسلمانوں کی بیخ کنی کرنے کے بجائے انھیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے اور ان کے کلچر اور روایات کے تحفظ کا سامان کر دیا ہے۔ یہ ایک ایسا کانٹا ہے جو اُن لوگوں کے دل میں کھٹکتا ہے جنھوں نے اسلام کو جاگیرداری، سرمایہ داری اور امپریلزم کی ڈھال سمجھ رکھا ہے اور عوام دوستی کے تمام تقاضے بالائے طاق رکھ کر اُس اسلام کے نام پر غلامی کی تحریک چلا رکھی ہے جو آزادئ انسان کا عظیم ترین نقیب بن کر آیا تھا۔ وہ اس خوف میں مبتلا ہیں کہ اگر مسلمانوں نے سیاسی مساوات کے ساتھ اقتصادی عدل و انصاف کی وہ راہ بھی دیکھ لی جو چین میں کار فرما ہے اور اسلام جس پر بے حد، بے حد، بے حد زور دیتا ہے تو پھر کیا ہو گا؟ وہ اسی لیے اُس اقبالؔ کے افکار سے لرزتے ہیں جس کی وفات پر ملک برکت علی مرحوم نے کہا تھا: "علامہ اقبال فوت ہو گئے، وہ فنا فی الاسلام اور پکے سوشلسٹ تھے۔" وہ اسی لیے اُس حسرتؔ موہانی کی مسلم لیگ کے دشمن ہیں جس نے کہا تھا:

درویشی و انقلاب مسلک ہے میرا
صُوفی مومن ہوں، اشتراکی مُسلم

وہ اسی لیے شاہ ولی اللہؒ سے لے کر مولانا عبید اللہ سندھیؒ تک کے انقلابی مسلمانوں کی تحریکوں کے برعکس ایک ملوکیت افروز تحریک کے داعی ہیں۔ وہ اسی لیے قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت کے قائل نہیں کہ انھوں نے فرمایا تھا:

> "جب یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی سوشلزم پر مبنی نظام قائم ہو گا تو نہ صرف میرے بلکہ کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔"

انھیں خطرہ ہے کہ مصر، الجزائر اور شام کی طرح پاکستان کے مسلمان بھی اقتصادی مساوات کی راہ پر نہ چل نکلیں۔ لیکن کیا جائے وہ بہلانے سے ہمیں جس راہ سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ راہ نجات کی راہ ہے۔ خود حاجی یوسف چانگ نے اپنے مضمون کے آخر میں کہا ہے:

> "اُس بات کا سب سے پہلا امکان کہ چین میں مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیا جائے اس وقت عمل میں آئے گا جب اسلامی دنیا مشرق و مغرب کے درمیان کشمکش میں موجودہ غیر جانبدارانہ رویہ ترک کر کے مغربی طاقتوں کی طرف جھک جائیں گے۔"

حاجی صاحب کے اس فرمان میں پہلی بات تو یہ اہم ہے کہ چینی مسلمان ابھی تک نیست و نابود نہیں کیے جا رہے، صرف اس کے امکانات ہیں اور پہلا امکان اُس وقت واقع ہو گا جب اسلامی ممالک مغربی سامراج کے زیرِ دام آ جائیں گے اور دوسری بات واضح تر ہے کہ جو جماعتِ اسلامی چینی مسلمانوں کے لیے تڑپ رہی ہے اگر خدانخواستہ چینی مسلمانوں پر کوئی آفت آئی تو وہی اُس کا سبب بنے گی کیونکہ انڈونیشیا ہو، مصر ہو یا پاکستان یہ اسی جماعت اور اس کے حواریوں کے مقدر میں لکھا گیا ہے کہ وہ مسلمان ممالک کو مغربی سامراج کے رحم و کرم پر لا ڈالے۔ خدا اُس دن سے چینی مسلمانوں کو بھی بچائے اور خود جماعت اسلامی کے قائدوں اور پیروؤں کو بھی کہ بہرحال وہ ہمارے کلمہ گو بھائی ہیں۔

لیکن چلتے چلتے اپنے ان کلمہ گو بھائیوں سے یہ پوچھنے میں کوئی حرج نہیں کہ آپ کو چین میں بسنے والے مسلمانوں کی تو بہت فکر ہے جنھیں اپنے ملک میں تمام انسانی حقوق حاصل ہیں اور جو صدیوں بعد زندگی کی نعمتوں سے مساویانہ سطح پر بہرہ ور ہو رہے ہیں لیکن آپ کو بھارتی مسلمانوں کی اتنی فکر کیوں نہیں جن کے بارے میں آپ کے قائد، حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا یہ بیان ۱۹۵۳ء کے فسادات کے بارے میں منیر رپورٹ کے اوراق کی زینت ہے:

جسٹس منیر: کیا آپ کو اس بات پر کوئی اعتراض ہوگا کہ ہندومت کے مطابق بنے ہوئے قوانین کے تحت ہندوستانی کے مسلمانوں کے ساتھ ملیچھوں اور شودروں جیسا سلوک روا رکھا جائے۔

مولانا مودودی: مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ منو کے قوانین کے تحت نظام حکومت میں ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ملیچھوں اور شودروں جیسا سلوک ہو اور انھیں حکومت میں کوئی حصہ نہ دیا جائے اور انھیں شہری حقوق سے محروم رکھا جائے۔

کیا مسلمانوں کے اس عظیم ہمدرد کے دل میں آج چین کے مسلمانوں کے لیے جو درد اُٹھا ہے وہ بھارتی مسلمانوں کے لیے روا رکھنا حرام ہے۔ اُسے جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا سے تعاون کرنا تو قبول ہے لیکن ماؤزے تُنگ کی مساوات قبول نہیں۔ بات اتنی ہے کہ چین کے عوام دوست انقلاب کو چینی مسلمانوں اور آزاد مسلمان ممالک کے عوام نے جس محبت کی نگاہ سے دیکھا ہے وہ اسلام کو جاگیرداری اور سرمایہ داری کا محافظ سمجھنے والوں کو ہضم نہیں ہو رہا۔ لیکن کیا کیا جائے، زمانہ کسی کا انتظار تو نہیں کرتا۔ اقبالؔ جہاں یہ بشارت دے گیا ہے:

جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

وہاں اُس نے اپنے خطبات میں یہ دیدہ ورانہ پیشگوئی بھی کی ہے:

"اسلامی دُنیا کے آس پاس اشتراکیت کی صورت میں جو نیا اقتصادی تجربہ کیا جا رہا ہے اُس سے اسلام کے مقدّر اور اس کی اصل رُوح کے بارے میں ہماری آنکھیں کھُل جانی چاہئیں۔"

کیا ——— یہ پیشگوئی نبی اکرمؐ کے اس مشہور قول کی بہترین ہمعصر تفسیر نہیں کہ **اطلبوا العلم ولو کان بالصین**؟

محمد حنیف رامے

حسین نقی

حالاتِ حاضرہ

معاہدہ تاشقند کی تیسری سالگرہ کے موقع پر لاہور میں جہاں آج سے تین سال قبل ایک طالب علم شہید ہوا تھا، جماعت اسلامی اور اس کے طالب علم محاذ، اسلامی جمعیت علماء کے اراکین نے انتہائی غلط طرز عمل کا مظاہرہ کیا اور جماعت اسلامی کے ایک جانے پہچانے لیڈر مسٹر صفدر حسن صدیقی اور ان کے حواریوں کے ہاتھوں تین طالب علم، جس میں ایک نوبن جماعت کا طالب علم شامل ہے، زخمی ہوئے۔

جماعتِ اسلامی اور اسلامی جمعیت طلباء نے ان دنوں عوامی جمہوری تحریک اور طالب علم تحریک کو سبوتاژ کرنے کے جو ہتھکنڈے اختیار کیے ہیں ان میں یوم تاشقند کے دن رونما ہونے والے واقعات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلباء جب اپنی اس ناپاک مہم میں ناکام ہو گئیں جو انھوں نے روزنامہ "مشرق" میں چھپنے والی خبر کی بنیاد پر شروع کی تھی اور کراچی کے غیور مسلمان باشندوں پر یہ اتہام لگایا تھا کہ ان میں سے چند نے نعوذ باللہ "اسلام مُردہ باد" کے نعرے لگائے اور دو لاکھ مسلمانوں میں سے روزنامہ مشرق، جماعتِ اسلامی اور اسلامی جمعیت طلباء کے نمائندوں کے سوا کوئی انھیں نہ سُن سکا اور نہ ملک کے بارہ کروڑ مسلمان عوام نے جماعت اسلامی کے اس اسلام دشمن پروپیگنڈے پر کان دھرا تو انھوں نے عوامی جمہوری تحریک اور طالب علم تحریک کو نقصان پہنچانے کے لیے یوم تاشقند کا انتخاب کیا۔

یوم تاشقند پر جب طالب علموں نے جلوس نکالا اور مغربی پاکستان اسمبلی پر خون آلود جھنڈا لہرایا تو انھوں نے معاہدۂ تاشقند کے خلاف نعرے لگانے کے علاوہ اپنے مطالبات کے حق میں بھی نعرے لگائے۔ ساتھ ساتھ طالب علموں کی اکثریت نے "بھٹو زندہ باد"، "بھٹو کو رہا کرو" اور "سوشلزم زندہ باد" کے بھی نعرے لگائے۔

لاہور میں ملک اسلم حیات کی سرکردگی میں وکلاء کا جلوس

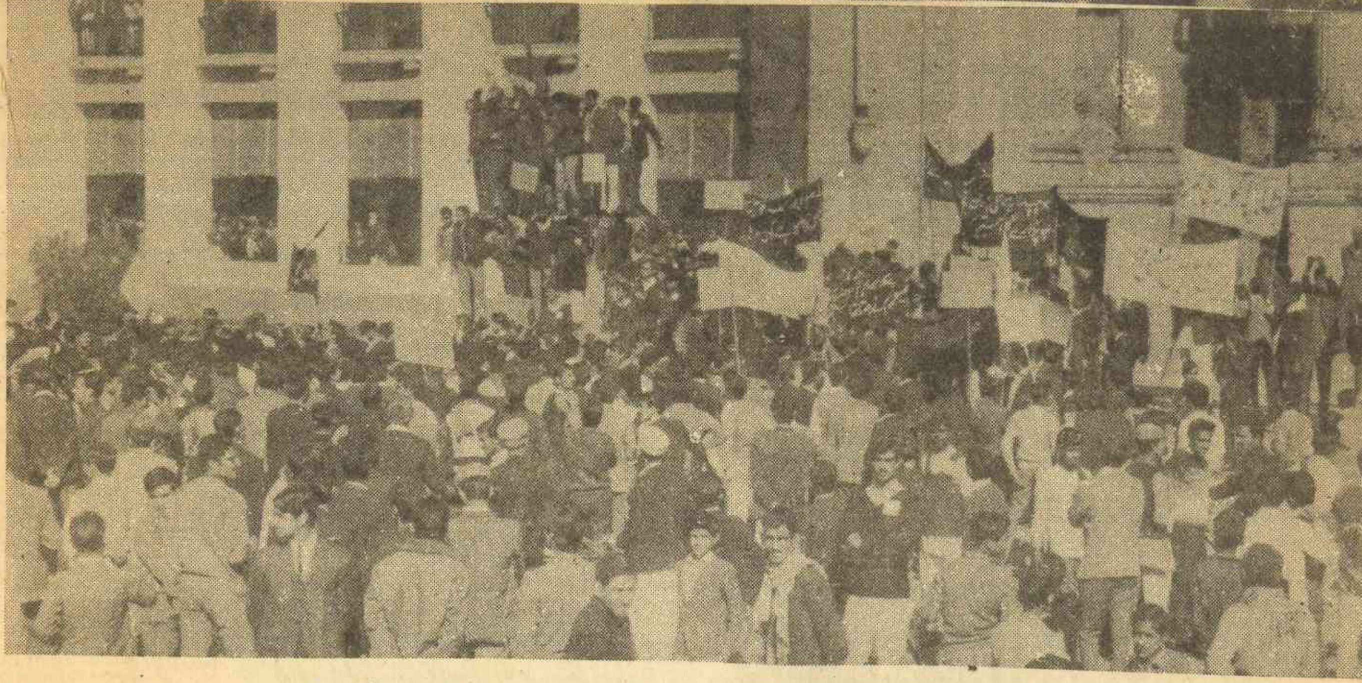

یوم شہدا (تاشقند) کے موقع پر لاہور کے طالب علم اسمبلی کے سامنے مظاہرہ کر رہے ہیں

جماعت اسلامی کی طرح اُس کے طالب علم محاذ کو بھی ان نعروں سے اَزلی کد ہے۔ پہلے تو انھوں نے جوابی نعرے لگائے اور جب اس طرح وہ کامیاب نہ ہو سکے تو انھوں نے اسمبلی سے واپسی کے وقت بعض طالب علموں کو مارنا پیٹنا شروع کردیا۔

کیا ننھا بھی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا ہے؟

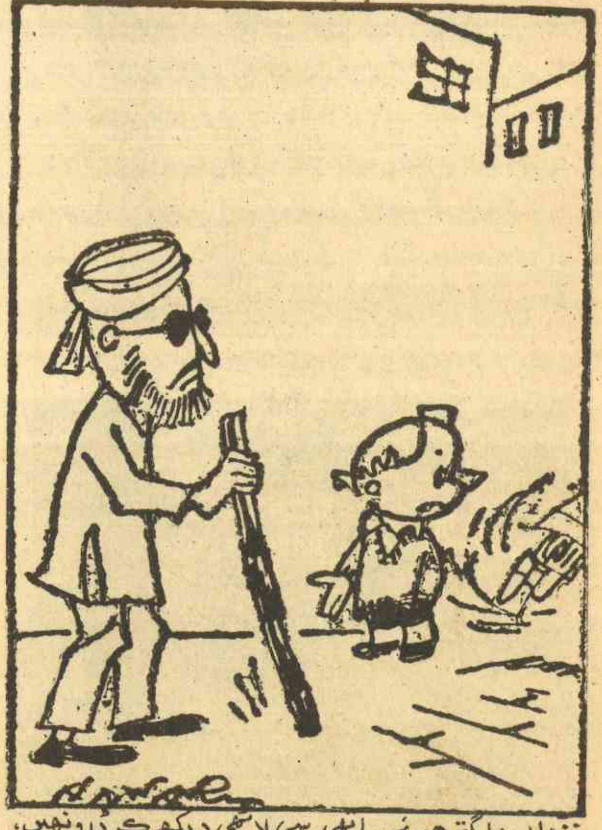

ننھا (بھاگتے ہوئے ساتھی سے) لاٹھی دیکھ کر ڈرو نہیں،

پھر جب طالب علموں کا جلوس نعرے لگاتا ہوا واپسی پر انار کلی پہنچا تو جماعت اسلامی کے مقامی لیڈروں اور کارکنوں نے طالب علموں پر لاٹھیوں کی بارش شروع کر دی جس میں کئی طالب علم زخمی ہو گئے۔ حزب اختلاف کی دوسری پارٹیوں کے لیڈروں کے بیچ بچاؤ کرانے پر نہتے طالب علموں کی جان بچی۔

یوم تاشقند کی صبح کو شہر کی سڑکوں پر ”خدا انھیں نیک ہدایت دے“ کے عنوان سے ایک پوسٹر بھی دیکھا گیا جس میں پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی پر لعن طعن کی گئی تھی۔

پھر طالب علموں کے جلوس میں ”اسلام دوست ترقی پسند طالب علم محاذ“ نامی ایک نوساختہ جماعت کے نام سے ایک پمفلٹ بھی تقسیم کیا گیا جس میں جناب ذوالفقار علی بھٹو پر نام لے کر لعن طعن کی گئی تھی اور طالب علموں کو ”بے رحم سیاست دانوں کا آلۂ کار“ بننے سے بھی ہوشیار رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جماعت اسلامی کے فاشی اصولوں کے عین مطابق دوسرے طالب علموں کو ”یہ تنبیہ“ کی جا رہی تھی کہ وہ ”سیاسی نعرے مت لگائیں۔“

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو شکوہ نہیں ہوتا

دو ٹکے کا آدمی

مغربی پاکستان اسمبلی کا سرمائی اجلاس میں حزب اختلاف نے پہلا واک آؤٹ کیا۔ یہ واک آؤٹ اسمبلی کے اسپیکر جناب چودھری محمد انور کے اس فیصلے کے خلاف بطور احتجاج عمل میں آیا جو انھوں نے اسمبلی چیمبر میں ۱۵ر جنوری کو حزب اختلاف کے رکن جناب حمزہ کی اس تحریک استحقاق پر دیا جو گورنر مغربی پاکستان مسٹر موسیٰ

مجاہد حریت، شورش کاشمیری کی لاہور میں آمد پر پیپلز پارٹی کے کارکن خوش آمدید کہہ رہے ہیں

نے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے سابق ممبر جناب ملک معراج خالد کے متعلق ان ریمارکس کے بارے میں تھی جو انھوں نے پاکستان مسلم لیگ کی اسمبلی پارٹی کے اجلاس منعقدہ ۱۳ر جنوری بمقام گورنر ہاؤس دیے تھے۔

اس رولنگ کے بارے میں مختصر تقریر کرتے ہوئے حزبِ اختلاف کے لیڈر خواجہ صفدر نے کہا کہ پارلیمانی طریقۂ کار کے مطابق یہ تو بالکل درست ہے کہ ایک بار جناب اسپیکر اپنی رولنگ جاری کر دیں تو اسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا پھر بھی ممبران اسمبلی اس بات کے مجاز ہیں کہ وہ اپنی تحریک کے بارے میں دلائل پیش کریں اور جناب اسپیکر اگر مناسب خیال کریں تو وہ اپنے فیصلے کو تبدیل کر لیں۔ خواجہ صفدر نے مزید کہا کہ جناب حمزہ نے گورنر صاحب کے ریمارکس کے متعلق اپنی تحریک استحقاق گورنر کی سرکاری حیثیت سے نہیں بلکہ مسلم لیگ پارٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے پیش کی تھی۔ گورنر صاحب نے مسلم لیگ کے رُکن کی حیثیت سے کنونشن لیگ کے ممبروں کے اجلاس میں بعض ہدایات اور ملک معراج خالد کے خلاف ریمارکس دیے تھے۔ یہ ریمارکس اہانت آمیز تھے۔ خواجہ صقدر نے مزید کہا کہ اسمبلی کی کارروائی سے متعلق رولز کے پیش نظر صدر اور گورنر کے، وہی احکامات چیلنج نہیں کیے جا سکتے جو دستور کے مطابق ہوں۔

اس موقع پر جناب حمزہ نے کہا کہ گورنر صاحب نے کہا تھا "معراج خالد دو ٹکے کا آدمی ہے۔ حیرت ہے کہ اسمبلی کے پچاس ارکان نے اس کے حق میں پٹیشن پر دستخط کیے"۔ جناب حمزہ نے مزید کہا: "ہم دو ٹکے کے آدمی سہی پر آدمی تو ہیں"۔

گورنر موسیٰ بہ لحاظِ عہدہ صوبے کے اعلیٰ ترین عہدیدار ہیں۔ انھیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ منتخب نمائندوں کو "دو ٹکے کا آدمی" کہیں۔ ملک معراج خالد قریباً چار سال سے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ممبر تھے۔ حکومت اور حزبِ اختلاف دونوں میں وہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔ وہ افریشیائی عوام کے اتحاد کی تنظیم کے سیکرٹری جنرل بھی ہیں اور افریشیائی ممالک میں پاکستان کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔ محض اس واسطے کہ آج وہ بعض اصولی اختلافات کی وجہ سے مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انھیں باعزت الفاظ سے بھی نہ یاد کیا جائے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس ملک میں چاہے کوئی شخص کسی بھی قدر و منزلت کا حامل کیوں نہ ہو جب بھی وہ حکومت سے باہر آتا ہے برسرِ اقتدار افراد اس کے خلاف ہر وہ لفظ استعمال کرنا ضروری خیال کرتے ہیں جو کسی بھی اعتبار سے مناسب نہ ہو۔ ملک معراج خالد پر ہی کیا منحصر ہے، حکومت کے ذمہ دار ارکان نے جن میں گورنر صاحب بھی شامل ہیں ملک کے سابق وزیرِ خارجہ اور آج کے مقبول ترین قائد جناب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف کیا کیا ناپسندیدہ الفاظ استعمال نہیں کرتے رہے ہیں۔ کاش عوام کو آدابِ سیاست کا درس دینے والے اپنے عمل سے بھی یہ ثابت کرتے کہ وہ ان آداب کی بذاتِ خود پابندی کرتے ہیں۔

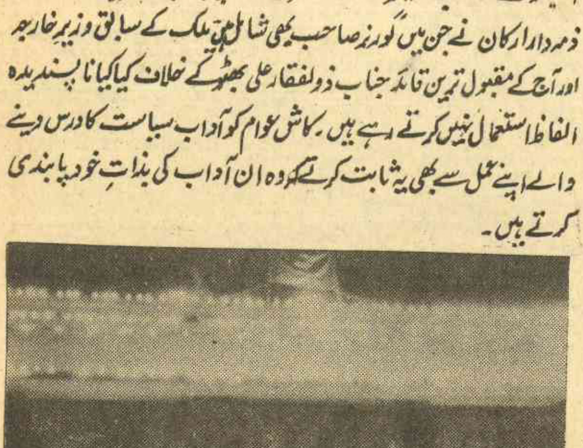

پیپلز پارٹی (گجرات) کے دفتر میں بھٹو صاحب کی سالگرہ کے موقع پر چراغاں

ذوالفقار علی بھٹو

سوشلزم اور اسلام

سوشلزم ہی سب کے لیے مساوی مواقع پیدا کر کے استحصال سے بچا سکتی ہے، طبقاتی امتیاز کی دیواریں توڑ سکتی ہے اور اقتصادی اور سماجی انصاف کو قائم کر سکتی ہے۔ سوشلزم جمہوریت کا اعلیٰ ترین اظہار ہے اور اس کی منطقی ثمر آوری۔ سوشلزم کا دائرۂ کار تا حدِ قیاس وسیع ہے۔ اُن ملکوں کے علاوہ جو انقلاب کی بھٹی سے گزرے ہیں کتنے ایسے ملک ہیں، جن میں دستوری شہنشاہیاں بھی شامل ہیں، جہاں تشدد آمیز تبدیلیوں کے بغیر سوشلسٹ تقاضوں کو بتدریج پورا کیا گیا ہے۔ سوشلزم کے اصول کی ہمہ گیری بنیادی طور پر دو باتوں پر منحصر ہے۔ اوّل، جدید سوشلزم کی بنیاد معروضی ہے۔ دوم، سوشلسٹ طرزِ فکر دنیا کے ہر خطے کے ہر ملک کے کارفرما اقتصادی اور سیاسی حالات سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ اس اعتبار سے سوشلزم پاکستان کے لیے براہِ راست توجّہ کے لائق ہے، جو ایک ایسا ترقّی پذیر ملک ہے جہاں داخلی اور خارجی استحصال کا دَور دَورہ ہے۔

قومی دولت کے زینے پر پاکستان سب سے نچلی سیڑھی پر کھڑا ہے اور انسانی ابتلاء کی جو مجموعی کیفیت یہاں پائی جاتی ہے وہ دُنیا بھر میں پاکستان جیسے کسی علاقے میں نہیں پائی جاتی جہاں بارہ کروڑ انسان بستے ہیں۔ پاکستان دنیا کا وہ علاقہ ہے جہاں افلاس کی گھٹائیں سب سے گہری ہیں۔ سوشلزم کے ذریعے اس داغ کو دھونا ہی پڑے گا۔ سب سے پہلا قدم یہ ہوگا کہ غاصبانہ سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا جائے اور سوشلزم کو حرکت میں لایا جائے۔ ذرائع پیداوار کو، جو صنعتی ترقی کو جنم دیتے ہیں، یا جن پر صنعتوں کا انحصار ہے، ہرگز نجی ہاتھوں میں نہیں رہنے دینا چاہیے۔ تمام کاروبار جو قومی معیشت کے بالائی ڈھانچے کی تشکیل کرتے ہیں، لازماً عوامی ملکیت میں ہونے چاہئیں۔

بنیادی ذرائع پیداوار اور ذرائع مبادلہ پر عوامی اختیار کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نجی سیکٹر کو ختم کر دیا جائے گا۔ نجی کاروباریوں کو اپنا مفید کردار انجام دینے کی مہلت دی جائے گی۔ لیکن وہ اجارہ دارانہ ذخائر قائم کرنے کے قابل نہ ہوں گے۔ نجی سیکٹر کو اُن حالات کے تحت پروان چڑھنا چاہیے جو نجی کاروبار کو زیب دیتے ہیں، یعنی مقابلے کے حالات، نہ کہ اس طرح کے سرکاری تحفظ کی آڑ میں، جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔

عوامی ملکیت کو ریاستی سرمایہ داری کی سطح پر گرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ محنت کشوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ مناسب ترغیبات کے ذریعے فیکٹریوں کو مستعدی کے ساتھ چلانے میں حصّہ لیں۔ ذرائع کو قومیانے کے ساتھ ساتھ ایسے اقدامات کیے جائیں گے جن کے باعث محنت کشوں کے حالات بہتر ہوں۔ انھیں مناسب سکونت، تفریح، اپنے اور اپنے کنبوں کے علاج، اور بچّوں کی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی اور ان تمام دوسرے طریقوں کو بروئے عمل لایا جائے گا جن سے اُن کا معیارِ زندگی اور ثقافتی سطح بلند ہو۔ ایک جگہ کے حالات دوسری جگہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ پاکستان میں جو سوشلزم نافذ ہو سکتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے نظریۂ حیات سے ہم آہنگ ہو اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے جمہوری ہو۔ کسی طرح کی بیرونی مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر سوشلزم کی اسکنڈے نیوین قسم ہو سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ سوشلزم کی پاکستانی قسم نہ ہو جو ہمارے مزاج کے حسبِ حال ہو۔ "سوشلزم ہماری معیشت ہے۔" کیونکہ سوشلزم کے بغیر ہم سچّی وحدت اور سچّی مساوات حاصل نہیں کر سکتے جو ایک ایسی قوم کے لیے اور بھی قیمتی ہے جو جغرافیائی طور پر دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہے۔

اسلام اور سوشلزم کے اُصول ایک دوسرے سے متضاد نہیں۔ اسلام مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور سوشلزم مساوات کے حصول کا جدید طریقہ ہے۔ پاکستان کے عظیم شاعر و فلسفی ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے پاکستان کے متعلق یہی خواب دیکھا تھا کہ سوشلسٹ طرز کی اسلامی ریاست ہوگا۔ اُن کے خواب کا صرف ایک حصّہ شرمندۂ تعبیر ہوا ہے۔ پاکستان ایک مسلمان ریاست ہے، لیکن اس میں کارفرما غاصبانہ سرمایہ داری، جس نے عوام کو تباہ و برباد کر دیا ہے، اسلامی اصولوں کی کھُلی خلاف ورزی ہے۔ پاکستان کے بانی محمّد علی جناحؒ نے بھی ایک سے زیادہ موقعوں پر اعلان کیا تھا کہ پاکستان سوشلسٹ طرزِ حکومت کی حامل اسلامی ریاست ہوگا۔ اپریل ۱۹۴۳ء میں دہلی کی تقریر کے دوران قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ یہی تھا کہ پاکستان میں ایک عوامی حکومت ہوگی۔ انھوں نے اُن زمینداروں اور سرمایہ داروں کو تنبیہ کی تھی جو عوام کا خون چوس چوس کر "ایک ایسے نظام کے ذریعے پھول پھل رہے ہیں جو انتہائی بدکارانہ ہے، جو انتہائی عیارانہ ہے اور جو انسانوں کو اتنا خود غرض بنا دیتا ہے کہ ان پر کوئی دلیل اثر نہیں کرتی"۔ انھوں نے کہا تھا:

"پاکستان کا دستور اور طرزِ حکومت وہی ہوں گے جو لوگ طے کریں گے۔"

"اسلام ہمارا دین ہے" اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔ اسلام کی برتری کے

بغیر پاکستان قائم نہیں رہ سکتا۔ سوشلسٹ انداز کی طرزِ حکومت اس برتری کی رقیب نہیں۔ اس کے برعکس سوشلزم پوری قوم کو اسلامی قدروں کا محافظ بنا دے گی تمام ذمہ داری کو اُن مٹھی بھر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے کر جنھیں بابائے قومؒ نے ایسے خود غرض افراد کا نام دیا تھا جن پر کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی، ہم نظریۂ پاکستان کو بیرونی اثرات کی زد میں لے آتے ہیں۔ بیرونی طاقتیں پاکستان کی پوری کی پوری آبادی کو نہیں خرید سکتیں۔ بیرونی طاقتیں صرف ایسے غرض مندانہ مفادات پر اختیار حاصل کر سکتی ہیں جن کا بیرونی سرمایے کے ساتھ کوئی مشترک مفاد ہو۔ حق تو یہ ہے کہ غرض مندانہ مفادات بیرونی طاقتوں کے پروردہ ہیں۔ ایک پوشیدہ ہاتھ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ترقی پذیر اقوام کی صفوں میں بے رحمی کے ساتھ محوِ حرکت ہے۔ پاکستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ بیرونی اثرات کو مہلت دی گئی ہے کہ وہ پاکستان کے اندر دُور دُور تک سرایت کر جائیں۔ متعدد موقعوں پر بیرونی دباؤ کے تحت بنیادی قومی مفادات پر سمجھوتہ بازی کی گئی ہے۔ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب عوام کو اختیار حاصل ہو۔ پوری کی پوری آبادی کو رشوت نہیں دی جا سکتی اور نہ سب کے سب بیرونی ایجنٹ ہی بن سکتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس قوم کے اسلامی نظریۂ حیات کا بہترین طور پر تحفظ پاکستان کے عوام ہی کر سکتے ہیں اور اس کے ضمن میں وہ مٹھی بھر صنعت کار کچھ نہیں کر سکتے جن کی فیکٹریاں، سال بہ سال، بیرونی امداد پر چل رہی ہیں۔

معروضی طور پر مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے درمیان کوئی تضاد نہیں، اگر ایسا کوئی تضاد ہوتا تو نہ مفکرِ پاکستان، اور نہ معمارِ پاکستان ہی نے، سوشلزم کی وکالت کی ہوتی۔ اُن کے نظریات کی دستاویزی شہادت موجود ہے اور ان کو چھوڑ کر اُن بے حرا افراد کے پیچھے لگنا کوئی معنی نہیں رکھتا جنھوں نے اس حکومت کی آڑ میں اتنے پر پُرزے نکالے کہ بابائے قوم کی تردید کرنے چل دیے۔ پاکستان کی تمام حکومتوں کی جانب سے ہونے والے اتحاد کی اپیل کو ایک ایک کر کے رد کیا گیا ہے یہاں تک کہ اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ موجودہ حکومت ایسی سازشیں کھود نکالنے لگی ہے جو قومی اتحاد کی جڑ کاٹ رہی ہیں۔ ایسا کیوں ہے جب کہ پاکستان کے حصول کی جدوجہد میں برصغیر کے مسلمانوں نے متحدہ طور پر حصّہ لیا تھا؟ پاکستان کے قیام کے وقت پاکستان کا اتحاد دوسرے ملکوں کے لیے باعثِ رشک تھا۔ یہ شاندار اتحاد کیوں ہوا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے؟ اسلامی بھائی چارا جو ہمارے اتحاد کی بنیاد فراہم کرتا ہے کیوں خطرے میں ہے؟ ہمارا شیرازہ اس لیے بکھر رہا ہے کہ موجودہ نظام میں عوام پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ ان کے حقوق منسوخ کر دیے گئے ہیں اور اُن کے مقدّر کو متاثر کرنے والے مسائل پر اُن کی رائے نہیں لی جاتی۔ عوام اور حکومت کے درمیان خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔

عوام کی بے دردانہ لُوٹ کھسوٹ قومی اتحاد کو کمزور کر رہی ہے اور ملک بھر میں شدید تناؤ پیدا کر رہی ہے۔ پاکستان کے اتحاد کو محض پند و نصائح سے یا صدارتی احکام سے قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ ان سب اور بہت سی دیگر متعلقہ وجوہ کی بنا پر لوگوں کے درمیان اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں۔ حالت بہر [illegible] سیاسی مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تعلقات ایک [illegible] کے آخری ہفتے میں بنگال کے ایک مرکزی وزیر نے اس پریشا[illegible] تھا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اُس نے ساری بے چینی کی وجہ یہ بتا[illegible] کا استعمال نوجوان نسل کو گمراہ کر رہا ہے۔ شاید وزیرِ موصوف کی نظر [illegible]سان ایک عارضی مظہر ہے۔ اس لیے انھوں نے نوجوانوں کے لتے لیے کہ وہ اُس نسل کے مصائب کو بھول گئے ہیں جس نے انگریزوں اور کانگرس کے ہاتھوں دُکھ جھیلے تھے۔ وزیرِ موصوف کو علم ہونا چاہیے تھا کہ کشیدگی کی وجوہ کہیں زیادہ گہری ہیں اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ ناکارہ درسی کتابوں کا اس میں کوئی دخل نہیں اور نہ ہی ہمارے عوام کے کمزور حافظے کا۔ نظریات ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور نظریۂ پاکستان، جو انصاف اور مساوات پر مبنی ہے، کوئی عارضی عنصر نہیں جو صرف ان لوگوں کے حافظے میں محفوظ رہے جنھیں برتی راج کے تحت دن گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔

جب آزادی کی رُوح کی جگہ غلامی کی کوئی نئی قسم مسلّط ہو جائے، تو گزشتہ قربانیوں کی یاد کے ساتھ ساتھ اور بہت کچھ بھی محو ہو جاتا ہے۔ مُلک کے گوشے گوشے میں جو حالات کارفرما ہیں وہ اصلاح کا تقاضا کر رہے ہیں اور مشرقی بازو میں یہ تقاضا سب سے شدید ہے۔

پاکستان ایک قوم، ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ جغرافیائی تقسیم قوم کو تقسیم نہیں کرتی۔ اس کا کوئی ایک حصّہ دوسرے حصّے پر فوقیت نہیں رکھتا کیونکہ سب برابر ہیں۔ پاکستان ایک سالم سانچے میں ایک ہی وقت میں ڈھالا تھا۔ پاکستان کے کسی جغرافیائی حصّے کو یہ حق نہیں کہ دوسرے سے بالا بالا اپنے لیے پاکستان کا نام اختیار کر لے۔ دونوں بازوؤں کے لوگوں نے آزادی کی خاطر، پاکستان کی خاطر، یکساں قربانیاں دیں اور مصیبتیں سہی ہیں۔ اگر مغربی پاکستان کو ریڈکلف کے غیر منصفانہ فیصلے کے ذریعے وسیع علاقوں سے محروم کر دیا گیا تو اسی طرح مشرقی پاکستان کو بھی اس کے علاقوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ دونوں بازوؤں کے بنیادی مفادات مشترک ہیں اور اگر تمام حصوں میں جمہوری مساوات نافذ ہو تو اتحاد بحال ہو جائے گا۔

پاکستان کا اتحاد اُس وقت بروئے عمل آئے گا جب عوام کو اُن کے سیاسی حقوق جن میں اقتصادی مساوات بھی شامل ہے، دے دیے جائیں گے۔ لُوٹ کھسوٹ جتنی زیادہ ہو گی قومی اتحاد اتنا ہی محال ہوتا چلا جائے گا۔ جتنی جلدی لُوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو گا، اتنی جلدی اتحاد کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ پاکستان کے وہ شاندار عوام، جن کی پشت پر ایک بھرپور اور قابلِ فخر تاریخی ورثہ ہے ماضی کی طرح دوبارہ متحد ہو جائیں گے۔ شرط یہ ہے کہ ان کے حقوق بحال کر دیے جائیں۔ یہی وجہ ہے پاکستان پیپلز پارٹی نہایت عزم کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ:

> اسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ طاقت کے مالک عوام ہیں۔

یہ چار ستون پاکستان کی عمارت کو مضبوط اور محفوظ بنا دیں گے جب یہ اصول نافذ ہوں گے تو تمام قسم کی اندرونی اور بیرونی تخریبی کارروائیاں رک جائیں گی۔ ان اصولوں کے پرچم تلے پاکستان برصغیر کے مسلمانوں سے کیے ہوئے عہد کو ایفا کرے گا اور جموں اور کشمیر کے عوام کو بھارت کے چنگل سے آزاد کرائے گا۔

("پاکستان کی سیاسی حالت" کا ایک باب۔ ترجمہ: محمد حنیف رامے)

ائیر مارشل اصغر خاں کا سیاسی کردار

ایک بے لاگ تجزیہ

بڑے سے بڑے جگادری سیاست دانوں کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ نومبر اور دسمبر کے مہینوں میں برسوں سے خاموش سیاسی فضا میں دم بدم تبدیلیاں ہوں گی، کہیں طلباء کے تازہ گرم خون کی سرخی سے شاہراہیں گلنار ہوں گی اور کہیں سالوں سے خوابیدہ دہ "بیانیہ سیاست دان" جنھیں اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے عید بقرعید کے موقع پر بیان جاری کرنے کے علاوہ کوئی توفیق ارزاں نہیں ہوتی شہروں کی سڑکوں پر نکل آئیں گے، فضاؤں میں عمر بھر پرواز کرنے والے قریہ قریہ اڑنے والی دھول پھانکیں گے اور نہاں خانوں میں بیٹھے "داستان طراز" قلم کار سر بازار پرچم لے کر نکل آئیں گے۔

یہ صورتِ احوال کچھ اس تیزی سے وارد ہوئی کہ اسے ذرا نچلی سطح پر ۶/ ستمبر ۶۵ء کے حملے کے برابر تصور کیا جا سکتا ہے۔ ۱۳/ نومبر کو پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے متعدد ساتھیوں کو ایک طرف اور نیشنل عوامی پارٹی کے صدر عبدالولی خاں اور ان کے ساتھیوں کو دوسری طرف بیک وقت گرفتار کرنے کے ذرا بعد گورنر مغربی پاکستان نے ریڈیو سے ایک خاص تقریر ضروری سمجھی (۶/ ستمبر ۶۵ء میں صدر محمد ایوب خاں کو ایک خاص تقریر کرنی پڑی تھی)۔

نیشنل عوامی پارٹی کے بارے میں تو کچھ زیادہ نہیں کہا جا سکتا مگر یوں معلوم ہوتا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کو جڑ پکڑنے سے پیشتر ہی اکھاڑ پھینکنے کی سر توڑ کوشش کی گئی ہے۔ افراتفری اور خوفناک پابندیوں کے اس زمانے میں کل گیارہ ماہ کی پیپلز پارٹی کی تنظیم ہی کون سی بنی تھی۔ حکومت کے علاوہ نیشنل عوامی پارٹی کا سی آر گروپ "پارس" یعنی کونسل مسلم لیگ کے میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ گوجرانوالہ بار ایسوسی ایشن کے جلسے میں، مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی اپنی عاملہ کے اجلاس میں، محمود علی قصوری ساہیوال بار ایسوسی ایشن میں اور جماعت اسلامی اپنے ہفتہ وار پرچوں میں ذوالفقار علی بھٹو کی "ڈیڑھ اینٹ کی مسجد" بنانے کی ادا پر بری طرح برس پڑے تھے۔ حکومت کی جانب سے صدر محمد ایوب خاں سے لے کر ہر امیر اور ہر وزیر اور ان کے مقبوضہ اخبارات رات دن اپنی طرف سے بھٹو پر بڑھ بڑھ کر وار کر چکے تھے اور آخرش "دہشت زدگی" کی پیداوار، یعنی ڈیفنس آف پاکستان رولز کا بے محابا استعمال کر کے بھٹو کو پسِ دیوارِ زنداں بھیجا جا چکا تھا۔

بھٹو نے سابق صوبہ سرحد سے گورنر صاحب کی اکیس توپوں کی سلامی کے جواب میں جو فائر کیا تھا اس کی گونج پورے ملک میں سنائی دی تھی۔ اس عرصے میں بولنے پر مامور وزیروں، امیروں اور لکھنے کی اجرت کرنے والوں کے علاوہ سب چپ تھے۔ دایاں بازو پاکستانی تحریک جمہوریت، بایاں بازو نیشنل عوامی پارٹی (دونوں حصے) اور چھ نکاتی عوامی لیگ ان سب پر جماعتی حیثیت سے مکمل خاموشی تھی۔ ولی خاں کی گرفتاری کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ پنجاب کی بار ایسوسی ایشنوں نے ان کی تقریر سننے سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے نہ زبان سے کوئی ایسی بات نکالی تھی اور نہ ان کا کوئی فعل ایسا تھا کہ انھیں اس مرحلے پر گرفتار کیا جاتا، بجز اس کے کہ بھٹو کی شخصیت کو سابق پنجاب میں داغدار کرنے کے لیے ولی خاں کو ان کے ساتھ شامل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ یوں تحریک جمہوریت کو جو پہلے ہی بھٹو صاحب کے اقدامات کو پسندیدہ قرار نہیں دے رہی تھی، ولی خاں والا نقاب ڈرانے کے لیے کافی تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی سابق پنجاب میں خود بھی ایسی سرگرم نہیں تھی کہ اپنے لیڈر کی گرفتاری کے بعد فوری طور پر کوئی جوابی کارروائی شروع کر سکتی۔ ثبوت یہ کہ پارٹی کا پہلا اہم اجلاس پورے دس دن بعد ۲۲/ نومبر کو لاہور میں ہوا۔

مختصر یہ کہ بھٹو صاحب اور ان کی پارٹی کا ناطقہ حکومت نے بزعمِ خود ۱۳/ نومبر ۱۹۶۸ء کو بند کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ ملک کے باہر جو شور و غوغا ہوگا وہ ملک کے اندر نہیں پہنچے گا۔ البتہ ملک کے اندر ملک غلام جیلانی اور ایسے لوگوں

کی نحیف آوازیں اُبھر کر اپنی ہی تنہائی میں ڈوب جائیں گی۔ مگر ”معاشی منصوبہ بندی“ کی طرح یہ ”سیاسی منصوبہ بندی“ بھی عوامی ضرورتوں اور جذبات کو نظر انداز کر کے کی گئی تھی۔ نتیجتہً لاہور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے ارکان اپنی کالی وردی میں مال روڈ پر مارچ کرتے ہوئے پائے گئے۔ یہ تاریخِ قانون میں پہلی بار ایک تاریخ ساز اقدام تھا جسے ہائی کورٹ بار کے بزرگوں نے ابتداءً سخت ناپسند کیا، مگر بعد میں ملک گیر سطح پر اپنا لیا۔

ان حالات میں جبکہ بھٹو اور ولی خاں کی گرفتاری کے بعد حکومت کو ”تحریکِ جمہوریت“ اور بائیں بازو (مرکز، دائیں بازو اور بائیں بازو) کی طرف سے خاموشی کا یقین مکمل ہوتا جا رہا تھا۔ ۱۵؍ نومبر کو پاکستان ایئر فورس کے پہلے کمانڈر انچیف ایئر مارشل محمد اصغر خاں نے سیاست میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۶؍ کو وہ لاہور پہنچے اور ۱۷؍ نومبر کو ایک پریس کانفرنس میں بھٹو اور دوسرے سیاسی لیڈروں کی گرفتاری کی مذمت کرتے ہوئے ”ضمیر کے بحران“ کے حوالے سے سیاسی میدان میں کُود پڑے۔ ایبٹ آباد سے آنے والے اصغر خاں چند دن پیشتر ایبٹ آباد میں ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے جن چار ساتھیوں کو کھانے کی دعوت دے چکے تھے، ان کے ”پابہ زنجیر“ ہونے سے پیدا ہونے والے ”خلا“ کو بھرنا چاہتے تھے۔ اس سے اگلے روز انھوں نے ہائی کورٹ بار کے ارکان سے خطاب کیا اور کار کی چھت پر چڑھ کر کہا: ”جب جلسہ عام کی اجازت ہو گی تب جلسے سے خطاب کروں گا، اجازت نہ بھی ہوئی تو دیکھا جائے گا۔“

بھٹو کے بعد یہ دوسری مجاہدانہ آواز تھی۔ صرف سُر مختلف تھا۔ اس وقت تک اصغر خاں صرف پی۔ اے۔ ایف کے سابق کمانڈر انچیف اور پی۔ آئی۔ اے کے سابق سربراہ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ انھوں نے چند مضامین دفاع کے مسائل پر ضرور لکھے تھے جن میں ”عوامی فوج“ کی ضرورت کے بھی واضح اشارے تھے، مگر کیسے؟ اس سوال کا جواب کوئی نہیں تھا۔ لاہور کی ایک خانہ ساز انجمن ”ایوانِ افکار“ کے ایک اجتماع میں وہ ایک مبہم سی تقریر کے گناہ کے بھی مرتکب ہوئے تھے۔ اس انجمن کو ملک کی معاشی، سیاسی، اور جغرافیائی حدود سے تو شاید زیادہ علاقہ نہیں مگر ”نظریاتی حدود“ کے بارے میں خاصی پریشان رہتی ہے۔ اسی لیے اس کی مجلسِ عاملہ میں سجاوٹ کے طور پر ایک صوبائی وزیر کا نام بھی رکن کی حیثیت سے موجود ہے۔ اس انجمن کے اسی کردار کے حوالے سے اصغر خاں کی تقریر کو بھی دیکھا گیا تھا۔

ایئر فورس کے سربراہ کی حیثیت سے اصغر خاں ایک انتہائی دیانت دار، راست باز، ذہین اور مستعد کمانڈر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ۱۹۵۸ء کے ”انقلاب“ میں اگرچہ بقول ان کا کوئی حصّہ نہیں، مگر اکتوبر ۵۸ء میں ایئر فورس کے نچلے درجے کے عملے کی تنخواہوں میں تقریباً دو اڑھائی گنا اضافہ کروانے کا گناہ ان سے انہی دنوں سرزد ہوا۔ غالباً ۵۸ء کے انقلاب میں ان کا یہی حصّہ ہے۔

ایئر فورس کے سربراہ کی حیثیت سے انھوں نے حکومت کے سیاسی معاہدوں کے مطابق مغربی ممالک خصوصاً امریکہ کی مدد کے ساتھ ایئر فورس کو پروان چڑھایا۔ یہی ایئر فورس امریکہ کے مقاصد کے بالکل اُلٹ ستمبر ۶۵ء میں برصغیر کی فضاؤں میں فاتح بن کر نمودار ہوئی اور اس میں چین کے مِگ ۱۹ کا بہترین اضافہ ہوا۔ ستمبر ۶۵ء نے ہماری اجتماعی، قومی اور انفرادی زندگی میں بہت زبردست تبدیلیاں کیں۔ جنگ سے صرف دو ماہ پیشتر اصغر خاں کو پی آئی اے کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔

پی آئی اے ایئر مارشل نور خاں کی سربراہی میں امریکہ کی مخالفت کے باوجود چین سے معاہدہ کر چکی تھی اور اب تک چین اور پاکستان کے درمیان پی آئی اے کی سروس جاری ہے۔

پی آئی اے کی سربراہی کے دنوں میں پی آئی اے ایمپلائز یونین اور کراچی کی جماعت اسلامی کے درمیان زبردست نظریاتی جنگ ہوئی۔ یونین کے رسالے ”منشور“ کا کردار اس ضمن میں بڑا واضح رہا اور ایک اطلاع کے مطابق جماعت اسلامی کے ”شور و غوغا“ کی بنا پر ”منشور“ کی تحریروں میں مداخلت کے لیے اصغر خاں سے کہا گیا مگر انھوں نے مداخلت کرنے سے انکار کر دیا۔

پی آئی اے سے علیٰحدگی کے موقع پر اصغر خاں نے ایک الوداعی استقبالیہ میں کہا تھا: اُس ملک میں کوئی آدمی ریٹائر ہونے کا نام ہی نہیں لیتا اس لیے میں نے سوچا میں ہی ریٹائر ہو جاتا ہوں۔

اصغر خاں کی ریٹائرمنٹ کا زمانہ بہت مختصر ہے جس میں ان کے مضامین اور لاہور کے ایک اجتماع اور پشاور یونیورسٹی کی کانووکیشن سے خطاب اور ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کے علاوہ کوئی اہم بات سامنے نہیں آئی۔ اصغر خاں نے جس انداز سے اپنے آپ کو ملازمت سے ریٹائر کروایا اسی انداز سے انھوں نے سیاست میں اپنی ریکروٹمنٹ کروائی۔ پہلی پریس کانفرنس میں ہی انھوں نے ”ضمیر کے بحران“ کے حوالے سے بات کی اور سیاسی لیڈروں کی گرفتاری کو زیادتی قرار دیتے ہوئے ”آزادیٔ رائے کے لیے فضا بنانے“ اور چلی ہوئی ”تحریک“ کو تقویت پہنچانے کے عزم کا اظہار کیا۔

اصغر خاں جس وقت سیاست میں آئے صورتِ حال یہ تھی:۔

۱۔ بائیں بازو کی جماعتیں غیر فعال اور منتشر تھیں۔

۲۔ دائیں بازو کی جماعتیں ”تحریکِ جمہوریت پاکستان“ کے نام سے ایک متحدہ محاذ سال ڈیڑھ سال سے بنائے بیٹھی تھیں مگر انتخاب کے بارے میں سخت سوچ بچار کے باوجود کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھیں۔ جسٹس محبوب مرشد خاں کے بارے میں افواہ تھی کہ وہ پی ڈی ایم کے نامزد صدارتی امیدوار ہوں گے۔ مگر وہ مغربی پاکستان سے واپس مشرقی پاکستان پہنچ کر بالکل خاموش بلکہ ”خانہ نشین“ ہو چکے تھے۔ تحریکِ جمہوریت کو عدالتی

سطح پر انتخاب لڑنے کے لیے کوئی امیدوار نہیں مل رہا تھا اور بنیادی جمہوریت کی سطح پر انتخاب لڑنے کے لیئے کم از کم "پروگرام کی بجائے ایک "بہت بڑی تبدیلی لانے والی تحریک" شروع کرنے کی ضرورت تھی۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی پاکستان میں تحریک جمہوریت کا ڈھیلا ڈھالا ڈھانچا تقریباً ہر قابلِ ذکر شہر میں موجود تھا۔

۳۔ مشرقی پاکستان میں شہروں میں عوامی لیگ کے چھ نکات اور دیہات میں بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی کی جڑیں موجود تھیں۔

۴۔ مختصراً یہ کہ تحریک جمہوریت کے ڈھانچے مغربی پاکستان میں زیادہ تھے جبکہ بائیں بازو کے ڈھانچے مشرقی پاکستان میں تھے۔

۵۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کا نقشہ انتہائی مبہم تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی بے عمل ہو چکی تھی اور پیپلز پارٹی ابھی ابھی عمل میں آئی تھی۔

چنانچہ اصغر خاں کے آتے ہی تحریک جمہوریت کو بھٹو کی گرفتاری کے بعد "بیانیہ احتجاج" سے آگے نکل کر سرِ بازار احتجاج کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ اسے اصغر خاں کی صورت میں ایک "صدارتی امیدوار" بھی نظر آ رہا تھا اور اس امیدوار کو، مغربی پاکستان میں بائیں بازو کی غیر منظم جماعتوں کے پیشِ نظر اپنی تنظیم اور اثر و رسوخ دکھا کر اپنی طرف مائل کرنا بھی مقصود تھا۔ چنانچہ لاہور میں تحریکِ جمہوریت کے قائدین، میاں ممتاز دولتانہ، چودھری محمد علی، میاں طفیل محمد، سردار شوکت حیات اور نوابزادہ نصراللہ خاں، کی قیادت میں جو جلوس نکلا اس میں ان دو پارٹیوں کو جھوٹے منہ بھی شرکت کی دعوت نہیں دی گئی جن کی "متاعِ عزیز" چھن چکی تھی۔ کونسل مسلم لیگ کے کارکنوں کے اجتماع میں طنزاً یہ بات کہی گئی کہ جب ہم اعلانِ تاشقند کی مخالفت میں جیلوں میں گئے تھے اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کہاں تھے۔

بہرحال تحریک جمہوریت کے تنِ مُردہ میں ذوالفقار علی بھٹو اور اصغر خاں کی وجہ سے جان پیدا ہوئی ورنہ اس سے تھوڑی دیر پیشتر جماعتِ اسلامی کی چین کے خلاف مہم کے باعث تحریک میں شامل دوسری جماعتوں کے سربراہوں میاں ممتاز دولتانہ، سردار ظفراللہ اور نوابزادہ نصراللہ خاں کو "چین دوستی" کا اعلان کرنا پڑا تھا اور لگتا تھا کہ شاید اس مسئلے پر تحریکِ جمہوریت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی مگر سرکاری اخباروں کی طرف سے جماعت کے اس "کمزور" پہلو کو دبانے کی مہم میں یک لخت نرمی پیدا ہوئی اور سیاسی گہما گہمی میں جماعت اسلامی خوش قسمت نکلی کہ لوگ کے غیظ و غضب سے بچ گئی۔

(طلباء کے مظاہروں کے دوران نہ جانے خاندانی منصوبہ بندی کے اتنے بورڈ کیونکر ٹوٹے۔ گرفتاریوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کا اس "خاندانی منصوبہ بندی دشمنی" کارروائی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔)

ان حالات میں ایئر مارشل محمد اصغر خاں سیاست کے میدان میں اُترے۔

ان کے لیے ایک صورت تو یہ تھی کہ وہ تحریکِ جمہوریت میں شامل جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ مل جائیں اور بھٹو نے جو تحریک شروع کی تھی اس سے تحریکِ جمہوریت کے حوالے سے پوری طرح فائدہ اُٹھائیں۔

دوسری صورت یہ تھی کہ غیر فعال نیشنل عوامی پارٹی یا انتہائی معتوب پیپلز پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ اس صورت میں ایک طرف تو تحریک جمہوریت کی ان سے ہمدردیوں میں معتدبہ کمی آ جاتی۔ دوسری طرف حکومت کے لیے ان کے خلاف ویسا ہی قدم اُٹھانا آسان ہو جاتا جیسا بھٹو کے خلاف اٹھایا گیا تھا۔ اور ان دونوں صورتوں میں ملک میں "بات کرنے کی آزادی" اور گرفتار ہونے والوں کے لیے "اخلاقی حمایت" حاصل کرنے کی کوشش انتہائی محدود ہو جاتی اور ایئر مارشل اصغر خاں تحریک جمہوریت کے "پلیٹ فارموں" سے محروم رہتے اور تحریکِ جمہوریت پر سختی سے قابض "جماعت اسلامی" اپنے ارادوں اور تدبیروں کے مطابق اُسے استعمال کرتی رہتی۔

تیسری صورت وہ تھی جو ایئر مارشل نے اپنائی۔ ایئر مارشل نے اب تک نہ تو پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے جلسوں سے خطاب کرنے سے گریز کیا نہ تحریکِ جمہوریت پاکستان سے اور نہ ہی انجمن شہریاں سے۔ انھوں نے ہر جگہ ایک سے ہی انداز میں بات کی، مثلاً:

- تحریک جمہوریت کے پلیٹ فارم سے انھوں نے یہ کہا کہ لیڈروں کی گرفتاریوں کے بعد مجھے تحریک کے کچلے جانے کا خدشہ تھا اس لیے مجھے سیاست میں آنا پڑا۔ گویا تحریکِ جمہوریت میں شامل تمام جماعتیں اس تحریک کو جسے بھٹو نے شروع کیا آگے لے جانے کی اہل نہ تھیں۔
- انھوں نے ہر پلیٹ فارم سے سیدھا حکومت کے اعلیٰ ترین ستون کو مخاطب کیا اور برسرِ اقتدار پارٹی کے غوغا آرائٹ پونجیوں کے شور شرابے کا نوٹس تک نہیں لیا اور "بات کرنے کی آزادی" اور لوگوں کے حقوق بحال کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی پچھلے انتخاب کے "غیر منصفانہ" ہونے کا اعلان کیا۔
- بدقسمت لفظ "اسلام" کے بارے میں کہا کہ اس لفظ کو اس ملک میں بہت بُری طرح استعمال کیا گیا ہے۔ بہرحال عوام اس سے معاشی، سیاسی اور معاشرتی مساوات اور انسانی شرف و وقار کا مطلب لیتے ہیں۔
- فوج کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تنبیہ نما انداز میں خطاب کیا کہ وہ سیاست میں غیر جانبدار رہے۔ افسر شاہی کے اعلیٰ ستونوں سے کہا کہ ان کا کام کسی فرد سے وفاداری نہیں مملکت سے وفاداری ہے اور وہ فرد کی وفاداری میں جائز حد کو عبور کرنا چھوڑ دیں۔
- آئین، خارجہ پالیسی، معاشی نظام وغیرہ کے متعلق دو ٹوک بات نہیں کہی مگر بھٹو کی طرح (تحریک جمہوریت کی اکثر جماعتوں کے بالکل برعکس) کہا کہ پختونستان اور جیئے سندھ کے مسئلے حکومت کے پیدا کردہ ہیں جو ان کو ہوا دے کر انتشار پھیلانے اور اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ خارجہ پالیسی کو اندرونی نظام اور حالات کے تابع قرار دیا۔

● عوام سے کہا کہ وہ سیاسی پارٹیوں میں شامل ہوں اور اس سے پہلے سیاسی پارٹیوں کے منشور پڑھیں اور ان کے لیڈروں کا ماضی دیکھ لیں تاکہ انھیں دوبارہ مایوسی نہ ہو۔

● اپنے مضامین کے علاوہ انھوں نے اپنی تقریروں میں بھی "عوامی فوج" کی ضرورت کا ذکر کیا۔ واضح رہے کہ ایک پیشہ ور فوجی کا "عوامی فوج" کا تصوّر یقیناً مسلم لیگ کی رضا کار ڈنڈا بردار فوج یا خاکسار تنظیم سے مختلف ہوتا ہے اور اس کے لیے مختلف سیاسی اور اقتصادی نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت جن ملکوں میں عوامی فوج ہے وہاں سوشلزم بھی ہے۔

● کشمیر کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ ملک کی سلامتی خطرے میں ڈالے بغیر حل کیا جاسکتا ہے اور یہ کہ موجودہ حکومت "کشمیر" کے بارے میں غیر سنجیدہ ہوتی جارہی ہے۔ یاد رہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کا بھی سب سے جذباتی منطقی اور بنیادی یہی نکتہ ہے اور یہاں سے ہی ان کا اختلاف موجودہ حکومت سے علیٰحدگی کی حد تک ہوا تھا۔

دولت، کنبہ پروری، چمک دمک، سیاسی مجمع بازی اور چرب زبانی اور جوڑ توڑ کی طاقت سے محروم ایر مارشل اصغر خاں اس وقت میدان میں کودے جب بھٹو کو زبردستی میدان سے ہٹایا گیا۔ حزب اختلاف میں سے تحریک جمہوریت بہت دیر براہِ راست وار کرنے اور وار سہنے سے گریزاں رہی مگر بھٹو اور اصغر خاں دونوں وار کرنے اور وار سہنے کے لیے میدان میں اُترے ہیں۔ دونوں موجودہ حزب اقتدار کی پیداوار ہیں اس لیے کہ حزب مخالف گذشتہ دس سال میں ایک آدمی بھی پیدا نہیں کرسکی۔ دونوں نے اس جگہ پاؤں رکھا ہے جہاں فرشتوں کے بھی پَر جلتے تھے اور عوام نے دونوں کو آنکھوں پر اُٹھالیا ہے کیونکہ وہ دونوں کو ایک ہی محاذ کا سپاہی سمجھتے ہیں۔ یہ محاذ "عوام کو بیدار کرنے کا مرحلہ" ہے۔

یقیناً یہ وہ مرحلہ ہے جسے اگر کامیابی سے طے کرلیا گیا تو اس سے آئندہ مرحلہ جہاں محترمہ فاطمہ جناح ناکام رہی تھیں نسبتاً آسان ہوجائے گا۔ اس مرحلے کو آسان بنانے کے لیے تمام پارٹیوں کے رویّے کے برعکس بھٹو نے مجاہدانہ رویّہ اختیار کیا تھا اور جو تحریک چلائی تھی اصغر خاں نے اسی تحریک کو سپاہیانہ سادگی کے ساتھ آگے چلایا ہے کیونکہ بھٹو اور اصغر خاں ۶۴ء کے محترمہ فاطمہ جناح کے انتخاب کو "دوسری طرف" سے دیکھ چکے ہیں۔ "حزب مخالف" کے ڈھیلے ڈھالے ڈھانچے اور ۵۶ء کے آئین کی بحالی کی تحریک کا انجام بھی ان کے سامنے ہے۔ اگر تحریک موجودہ مرحلے پر کامیاب نہیں ہوتی اور اس کے لیے ساری حزب مخالف کی مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے تو دوسرے مرحلے یا میدان میں جس میں ابھی صوبائی مسلم لیگوں کی درخواست کے باوجود صدر محمد ایوب خاں بھی نہیں اُترے، کامیابی کے امکانات بہت کم ہوجاتے ہیں۔ یہ بھٹو اور اصغر خاں دونوں جانتے ہیں۔ اور غالباً انھیں یہ احساس ہے کہ دوسرے میدان یا مرحلے پر ہی جاکر دائیں اور بائیں بازو کے امتیاز کا مسئلہ اُٹھایا جانا چاہیے۔ کیونکہ پہلے مرحلے کی کامیابی کے بغیر دوسرے مرحلے کی بات کرنا "حماقت" ہوگا۔ غالباً اسی لیے ذوالفقار علی بھٹو نے پیپلز پارٹی کے قیام کے موقع پر کہا تھا:

"پہلے بائیں بازو کی پارٹیوں میں اتحاد ہونا چاہیے، دائیں بازو میں پی ڈی ایم کی صورت میں اتحاد ہوچکا ہے۔ پھر دونوں بازوؤں کو مشترکہ طور پر جدوجہد کرنی چاہیے۔"

اس صورتِ حال کا علم غالباً نہ انتہائی دائیں بازو کو ہے نہ انتہائی بائیں بازو کو۔ انتہائی دائیں بازو کی جماعت اسلامی کے طفیل محمد کراچی میں کہہ چکے ہیں:

"سوشلزم کی علمبردار جماعتیں تشدّد اور غیر آئینی طریقوں سے تبدیلی لانا چاہتی ہیں مگر ان کی تبدیلی سے بہتر موجودہ قیادت (صدر ایوب) ہے۔"

جبکہ سی۔ آر اسلم گروپ بھی نہ تو فیلڈ مارشل کی جگہ ایر مارشل کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے اور نہ فیلڈ مارشل کے ساتھ آٹھ سال تک رہنے والے لاڑکانہ کے بڑے زمیندار کو۔ دونوں انتہاپسند گروہ یہ محسوس نہیں کررہے کہ عوامی تحریک کے لیے دائیں اور بائیں بازو کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ کیونکہ یہ تحریک سیاسی بھی ہے اور اقتصادی بھی۔ اس میں جمہوریت اور سوشلزم دونوں کا حصّہ ہونا چاہیے۔ سیاسی تبدیلی تو مادرِ ملت بھی لانا چاہتی تھیں جو نہ لاسکیں۔ سیاسی تبدیلی اب بھی معاشی اور معاشرتی تبدیلی کے بغیر نہیں لائی جاسکتی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس کا اعلان کر رکھا ہے۔ اصغر خاں نے اس پر کھل کر ابھی بات کرنی ہے اور وہ آہستہ آہستہ کھل بھی رہے ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے بھٹو کو صدارتی امیدوار نامزد کرکے "پی ڈی ایم" کو جتنا ناراض کیا ہے اصغر خاں کو ہرگز نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے پارٹی کے اس فیصلے کو دیانتدارانہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ "جمہوری مجلس عمل" کی طرح پیپلز پارٹی بھی موجودہ حکومت کے خلاف صف آرا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جمہوری مجلس عمل انتخابات کے بائیکاٹ کے ذریعے یہ کام کرنا چاہتی ہے اور پیپلز پارٹی انتخابات میں حصّہ لے کر۔ اگر دیکھا جائے تو اس وقت اصغر خاں کا سیاسی کردار یہ ہے کہ وہ دائیں اور بائیں بازو کے درمیان پُل کا کام کررہے ہیں۔

بھٹو کی کوشش ہے کہ بائیں بازو کو متحد کیا جائے۔ اصغر خاں کی کوشش ہے کہ دائیں بازو کو بے عملی سے نکال کر فعال بنایا جائے۔ اگر یہ دونوں قائد اپنے اپنے ابتدائی کام میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور دوسرے مرحلے پر اکٹھے ہوکر موجودہ حکومت اور موجودہ نظام کے خلاف مشترکہ مہم چلاتے ہیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ جلد ہی عوامی تحریک کو ایک روشن مستقبل نصیب ہوجائے گا۔

نصرت کے اگلے شمارے میں

ذوالفقار علی بھٹو کا مقدمہ

۱۵/ جنوری تک کی مکمل روداد
شائع کرنے کا اہتمام کیا جارہا ہے

اعلان تاشقند کی مذمت میں لاہور میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا جلسہ۔ مسٹر جے اے رحیم نے اجلاس میں شرکت کی۔ اسلم گورداسپوری تاشقند پر اپنی نظم سنا رہے ہیں

سیاسی ڈائری — پاکستانی

عوامی جدّ و جہد کو عوامی جماعتیں ہی آگے بڑھا سکتی ہیں

پی۔ ڈی ایم کی قومی مجلس عاملہ نے ڈھاکہ کے اجلاس میں آئندہ انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی تین دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر جمہوری مجلس عمل قائم کی جس نے اپنے آٹھ نکاتی مشترکہ پروگرام کا اعلان کرتے ہوئے آئندہ انتخابات کے بائیکاٹ پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ مولانا بھاشانی کی جماعت اس میں شامل نہیں ہوئی لیکن اس نے اپنے طور پر انتخابی بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پی۔ ڈی۔ ایم کا انتخابی بائیکاٹ کا فیصلہ مسٹر بھٹو کو صدارتی امیدوار کے طور پر پیش کرنے کا براہِ راست ردّ عمل ہے۔ پیپلز پارٹی کے قائم مقام چیئرمین مسٹر جے۔ اے۔ رحیم نے جب لاہور میں یہ اعلان کیا کہ مسٹر بھٹو صدارت کے لیے موزوں ترین امیدوار ہیں اور عوام کی آرزوؤں کا مظہر تو پی۔ ڈی۔ ایم کے حلقوں میں اس کا شدید ردّ عمل ہوا۔ حالانکہ اتنی تلخی کے لیے وجہِ جواز نہ تھی۔ انتخاب لڑنا یا نہ لڑنا صرف طریقِ کار کا اختلاف ہے، مقاصد کا اختلاف نہیں۔ ساری جماعتیں جو اس وقت حزبِ اختلاف سے وابستگی کی دعوے دار ہیں، اپنے اعلانات کے حوالے سے موجودہ غیر جمہوری حکومت اور آمرانہ آئین سے گلوخلاصی کرانے پر متفق ہیں۔ عوام بھی اس بارے میں اپنی قطعی رائے کا اظہار ہر دم بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تحریک کے ذریعے کر چکے ہیں۔ اب فوری نوعیت کا مسئلہ تو اتنا ہے کہ موجودہ حکومت کو کیسے بدلا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے مختلف جوابات ہو سکتے ہیں۔ انتخابات لڑنے یا نہ لڑنے کا مسئلہ بھی ان ہی جوابات کی مخصوص صورت ہے۔ اگر مقصد کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے تو حزبِ اختلاف کی جماعتوں کو اس مسئلے پر ایک دوسرے کا گریبان کھینچنے کی ضرورت نہیں۔ آخر انتخابات میں ابھی کئی مہینے پڑے ہیں اور اس عرصے میں بہت سے نئے حالات جنم لے سکتے ہیں۔

وقت اب ایک سیلِ رواں بن چکا ہے اور اس کا طوفان خیز دھارا ہر دم نئی راہوں پر رواں دواں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ بعض لوگوں کی بصیرت ان طوفانوں کی راہوں سے آشنائی پیدا کر چکی ہو اور اس لحاظ سے مستقبل کا تعین کرنے کی زیادہ اہل ہو۔ بہر حال اس مسئلے پر جتنی تلخی پیدا کر دی گئی ہے اور جس طرح اس کو موجودہ سیاسی صورتِ حال کا بنیادی مسئلہ بنا دیا گیا ہے وہ کسی دانشمندی کا مظہر نہیں۔ جب تک مسٹر بھٹو کو صدارتی امیدوار کے طور پر پیش نہیں کیا گیا تھا پی۔ ڈی۔ ایم پر ایک تذبذب کا عالم طاری تھا۔ اس موڑ پر دائیں بازو کی جماعتیں اپنے اندرونی تضاد میں پھنسی ہوئی تھیں اور ان کے لیے کسی مثبت راہ کو اختیار کرنا بڑے مخمصے کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ اس بات کا کافی امکان تھا کہ حزبِ اختلاف کا یہ گروہ کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ پاتا اور یہ فیصلہ کسی مناسب فضا کے انتظار میں ملتوی کر دیا جاتا۔ لیکن جونہی مسٹر بھٹو کو انتخابی امیدوار کے طور پر پیش کیا گیا پی۔ ڈی۔ ایم کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔ چنانچہ جس جلدی سے انتخابی مقاطعے کا فیصلہ ہوا اور پھر جتنی پھرتی سے آٹھ جماعتوں نے اشتراکِ عمل کا فیصلہ کیا، اس نے تو یہی تاثر دیا ہے کہ مثبت طرزِ فکر کی بجائے ایک خطرے سے مدافعت کی خاطر یہ فوری اقدامات کیے گئے ہیں۔ گویا منفی رجحانات نے غالب آ کر یہ فیصلے کروائے ہیں۔ ایک تاثر یہ بھی بنتا ہے کہ چونکہ پیپلز پارٹی کے فیصلے کا اعلان بھی ایکا ایکی کیا گیا ہے اور اس فیصلہ کرنے میں دوسری جماعتوں کو اعتماد میں نہیں لیا گیا اس لیے ان جماعتوں کی عزتِ نفس مجروح ہوئی چنانچہ اسی تلملاہٹ میں ان پر لازم ہو گیا کہ وہ پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کے لیے جواب آں غزل" ضرور تحریر کریں۔ انہوں نے انتخابی مقاطعے سے کم از کم پیپلز پارٹی کو

ہفت روزہ نصرت لاہور/ ۱۹ جنوری ۱۹۶۹ء

فوری طور پر الگ تھلگ ضرور کر دیا ہے۔ یہ جماعتیں اپنے دلوں میں ضرور مطمئن ہیں کہ انہوں نے پیپلز پارٹی کو اس کی پیش قدمی کی سزا دے دی ہے۔ اب گیند پیپلز پارٹی کے ضمن میں ہے اسے کس طرح کھیلتی ہے۔ لیکن پیپلز پارٹی کو یہ اطمینان ہے کہ اس نے حزب اختلاف کی مرضی کے خلاف فیصلہ کیا ہو تو کیا ہو عوام کی مرضی کے خلاف فیصلہ نہیں کیا۔

عوام کے نقطۂ نگاہ سے اس اختلافی صورت حالات میں گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ عوام کی جنگ صرف حق بالغ رائے دہی لے کر ختم نہیں ہو جاتی۔ انہیں تو بہت آگے تک جانا ہے اور معاشی و معاشرتی مساوات کی منزل تک پہنچنا ہے۔ یہ ایک طویل اور کٹھن جدوجہد کا راستہ ہے انہیں اس کا احساس ہے کہ دائیں بازو کی بہت سی جماعتیں جو صرف سیاسی جمہوریت تک ان کا ساتھ دیں گی وہ معاشی جمہوریت کی جنگ میں نہ صرف ساتھ چھوڑ جائیں گی بلکہ مخالف کیمپ میں جا بیٹھیں گی۔ عوام میں اور دائیں بازو کی جماعتوں میں مقصد کا یہ فرق بڑا اہم ہے۔ مقاصد کے اس فرق سے طویل منصوبہ بندی میں اور طریق کار میں ایسا اختلاف پیدا ہوتا ہے جس کی نوعیت کو سمجھنا عوامی نقطہ نگاہ سے بڑا ضروری ہے۔

دائیں بازو کی جماعتیں جو زیادہ سے زیادہ سیاسی جمہوریت کو ہی آخری منزل سمجھتی ہیں وہ سیاسی آزادی مثلاً بنیادی حقوق، تحریر و تقریر کی آزادی اور ووٹ دینے کی آزادی کو قوت حاکمہ سے بطور مراعات حاصل کرنے میں یقین رکھتی ہیں۔ ان کا طریقہ کار عرضداشتوں تک محدود ہے جسے وہ کبھی بلند بانگ ہو کر اور کبھی مدھم سُروں میں الاپتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس عوام کی نگاہیں چونکہ سیاسی جمہوریت سے اگلی منزل پر لگی ہوئی ہیں اس لیے ان کا طریق کار عرضداشتوں والا نہیں ہو سکتا۔ وُہ سیاسی حقوق بھیک کے طور پر حاصل نہیں کریں گے بلکہ اپنی جدوجہد سے حاصل کریں گے۔ یہ جدوجہد ان کے لیے بذات خود بھی ایک اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنی اگلی منزل یعنی حقیقی جمہوریت تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔

عوامی نقطۂ نگاہ سے انتخاب لڑنے یا نہ لڑنے کا مسئلہ اپنی ذات میں کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ عوام کے لیے بنیادی مسئلہ ان کی اپنی جدّوجہد ہے۔ اگر تو عوام کو سیاسی حقوق ان کی جدّوجہد کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں تو یہ ان کی کامیابی ہے کیونکہ اسی جدوجہد کے تسلسل میں انہیں اپنی اگلی جنگ لڑنی ہے۔ اگر سیاسی جمہوریت کی بحالی عوامی تحریک کے ذریعے ہوتی ہے تو گویا اگلی راہیں بھی سنور گئیں اور وہ حوصلہ مندی بھی پیدا ہو گئی جو دامن کوہ کو چیر کر جوئے شیر لا کر رہے گی۔ لیکن سیاسی جمہوریت حاصل کرنے کی قیادت جب دائیں بازو کی جماعتوں کو مل جائے اور عوام یا تو اپنی جدوجہد سے بے نیاز ہو جائیں یا انہیں تحریک شروع ہی نہ کرنے دی جائے تو اس کا انجام یقیناً سودے بازی کی صورت میں ہوگا۔ یہ جماعتیں کچھ مراعات لے کر مطمئن ہو جائیں گی اور پھر خود بھی اقتدار میں شامل ہو کر عوامی جدّوجہد کا گلا گھونٹنے میں مصروف ہو جائیں گی۔ تاریخ کئی ایسے چیانگ کئی شیک اور اس کی کومنتانگ جماعتوں کے تذکروں سے بھری ہوئی ہے جنہوں نے پہلے سیاسی آزادی کی جنگ لڑی پھر عوامی حقوق کے غاصب بن کر ایک آمرانہ اور متشددانہ حکومت عوام پر مسلط کر دی۔

ہمارے ملک کی سیاسی صورتِ حال کے پس منظر میں یہ خطرہ بڑا حقیقی ہے اور اس کی مدافعت بڑی ضروری ہے۔ اصل بات انتخاب لڑنا یا نہ لڑنا نہیں ہے بلکہ عوامی جدوجہد ہے اور اس جدوجہد کے ذریعے ہر قسم کی سودے بازی کا راستہ روکنا ہے۔ دائیں بازُو کی جماعتیں اپنے مزاج کے اعتبار سے مفاہمتوں اور سمجھوتوں کی جانب بہت جلد پھسل جاتی ہیں اور اس طرح عوامی جدّوجہد کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ پی۔ ڈی۔ ایم نے انتخابات لڑنے کے لیے جن پانچ شرائط کو بنیاد بنایا ہے برسر اقتدار طبقے کے لیے ان میں سے اکثر پر سمجھوتا کر لینا کوئی مشکل نہیں۔ فرض کر لیجیے ان میں ہنگامی حالات وغیرہ ختم کرنے اور شہری آزادیوں کی بحالی اور اس قسم کی دوسری باتیں مان لی جاتی ہیں تو کیا عوام مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں گے اور دائیں بازو کی جماعتوں کو یہ حق دے دیں گے کہ اب وہ اقتدار کی بانٹ میں شامل ہو جائیں اور معاشی جمہوریت کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں۔ یقیناً ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔ جدوجہد کا تسلسل اور جدوجہد کے ذریعے عوامی اتحاد قائم رکھنا ضروری ہے۔ عوامی جدوجہد ہی وہ کسوٹی ہے جس پر ہر جماعت کے فیصلے کو پرکھا جائے گا۔ اس کسوٹی پر کھوٹے کھرے کی تمیز کرنا کوئی مشکل نہیں رہتا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جو پیپلز پارٹی کے لیے خصوصاً اور بائیں بازو کے لیے عموماً ایک چیلنج کے مترادف ہے۔ عوامی جدوجہد کو عوامی جماعتیں ہی آگے بڑھا سکتی ہیں۔

نیشنل عوامی پارٹی (سی آر اسلم گروپ) کے پروفیسر مبارک حیدر اور شیخ عبدالغفور پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس تقریب میں بیگم نصرت بھٹو اور ملک معراج خالد نے شمولیت کی۔ شیخ محمد رشید تقریر کر رہے ہیں ——

اسلام اور جماعتِ اسلامی

اس حقیقت سے کسی بھی مسلمان اور سلیم العقل انسان کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلام مسلمانوں کے لیے دین ہے اور دین سے مراد ضابطۂ حیات ہے اور مسلمانوں کا ضابطۂ حیات یا آئینِ زندگی قرآن ہے! اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی سب کو معلوم ہے کہ "جماعت اسلامی" اپنے آپ کو اسلامی نظامِ حیات کے قیام کے واحد علمبردار کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ لہٰذا آیئے دیکھیں کہ اس جماعت کا یہ دعویٰ کہاں تک قرآن کے مطابق ہے؟ ذیل میں قرآنِ حکیم کے چند ایک واضح احکام اور ان کے مقابلے میں "جماعت اسلامی" کے مؤقف کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ اہلِ فکر و نظر اندازہ فرما سکیں کہ اس جماعت کے دعوؤں کی حقیقت کیا ہے:-

قرآنی احکام

۱۔ زمین کو صرف اس لیے پیدا کیا گیا کہ یہ تمام نوعِ انسان کے لیے یکساں طور پر کام آئے ($\frac{۵۵}{۱۰}$) زمین نوعِ انسان (سب کے لیے یکساں طور پر) مستقر اور متاع ہے ($\frac{۲}{۳۶}$) یہ تمام انسانوں اور حیوانوں کے لیے متاعِ زیست ہے ($\frac{۸۰}{۳۲}$) اللہ نے زمین میں تمام لوگوں کے لیے سامانِ معیشت رکھا ($\frac{۷}{۱۰}$) اس سے سب کو استفادے اور اپنی ضروریاتِ زندگی کے حصول کا یکساں حق حاصل ہے ($\frac{۴۱}{۱۰}$) (اور اس سے ضروریاتِ زندگی کے حصول کا اصول اور قانون یہ ہے کہ) ہر شخص خود کام کرے اور کسی کی محنت کے ثمر کو چھیننے کا کسی کو بھی اختیار نہیں ہے۔ ($\frac{۵۳}{۴۹}$)

جماعتِ اسلامی

۱۔ "آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسی ایک معاملے میں شریعت کا میلان یہ ہے کہ آدمی کے حدود ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے؟ یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حدِ خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لیے عملاً بیکار کر دیا جائے؟ اسی طرح وہ (اسلام) یہ نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس کو خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شراکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل نہیں۔" (مسئلۂ ملکیتِ زمین۔ ص ۸۲، ۸۳، ۱۱۵ مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

زمین اور کائنات کا مالک اور خالق خدا ہے ($\frac{۴۵}{۲۲}$) اور مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہے کہ زمین پر کسی بھی فرد کو لامحدود ملکیت اور جائداد قائم کرنے کا حق نہیں ہے۔ جب زمین کی ملکیت خدا کی ہے تو اس پر شخصی ملکیت قرآن اور اسلام سے انحراف ہوگی اور اس لیے ان حالات میں اس پر اجرت یا شراکت پر کاشت کرانا بھی خلافِ اسلام ہے۔ خدا نے اس کو تمام انواع کے لیے صرف اس لیے پیدا کیا کہ سب اس پر رہائش کر کے اس سے اپنا رزق خود کام کر کے حسبِ ضرورت بلا روک ٹوک حاصل کریں۔ اس کے برعکس مودودی صاحب اور "جماعت اسلامی" کا مؤقف یہ ہے کہ زمین پر ایک گروہِ افراد خدا کے حقِ ملکیتِ زمین پر تصرفِ بیجا کر کے لامحدود ملکیت اور جائداد کا مالک ہو کر دوسرے لوگوں کو اپنی مرضی کے تابع مہمل بنا کر ان کی محنت کے ماحصل کو سلب کرنے میں حق بجانب ہے۔ اس واضح سلب و نہب اور استحصال کو وہ "انتفاع" کا نام دیتے ہیں جس نظامِ زمینداری کو قرآن ظلم کہتا ہے ($\frac{۴۵}{۲۲}$) "جماعت اسلامی" کے نزدیک یہی ظلم اسلام ہے!

قرآنی احکام

۲۔ رزق و مال کی تحصیل کے لیے قرآن کا واحد اصول یہ ہے کہ "ہر شخص خود کام کرے اور اپنے کام کے ماحصل کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہو۔" ($\frac{۵۳}{۴۹}$) اس طرح کام کرنے سے اگر کسی کے پاس اپنی ضروریات سے زائد کچھ بچ جائے تو "وہ سب کا سب ملت کی تحویل میں دے۔" ($\frac{۲}{۲۱۹}$) "تاکہ ملکی دولت صرف چند مخصوص لوگوں کے درمیان گردش نہ کرتی رہے۔" ($\frac{۵۹}{۷}$) اور اسلامی معاشرے میں وہ بھیانک، اخوت سوز اور خطرناک اونچ نیچ پیدا نہ ہونے پائے جس میں "لوگ سونے اور چاندی کے ڈھیر جمع کرتے ہیں اور ان کو عوامی فلاح کے لیے عام نہیں ہونے دیتے۔ ایسے لوگوں کو الم انگیز عذاب کی خبر دے دو۔ اس نظام کو نہ تو پہلے بقا حاصل ہوئی اور نہ ہی اب ہوگی۔ یہ لوگ اُس آگ کا ایندھن ہوں گے جس میں ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے اُس مال کا انجام جسے (تم دوسروں کو محروم کر کے) اپنے واسطے جمع کرتے تھے۔ اب اپنے جمع کیے ہوئے کا مزہ چکھو۔" ($\frac{۹}{۳۴،۳۵}$)

جماعتِ اسلامی

روپیہ، پیسہ، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرضیکہ کسی چیز کے معاملے میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ وہ (اسلام) ہم سے نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنا تجارتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ پھر وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اُسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو۔"

(مسئلۂ ملکیت زمین۔ ص ۵۲ - ۱۱۵)

مندرجہ بالا آیات سے غیر مبہم طور پر واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے استحصال سراسر ناجائز ہے۔ کوئی بھی مسلمان اپنی ضرورت سے زائد ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا اور جب صورتِ حال یہی ہے تو پھر کسی کے لیے ذاتی صنعتیں قائم کرنے اور دوسروں سے اُن کو اُجرت پر چلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بایں ہمہ اگر کوئی ان احکام کے باوجود زراندوزی کرے گا تو اس کے لیے جہنم کے عذاب کی بشارت دی گئی ہے۔ مگر "جماعت اسلامی" کے امیر استحصال اور بلا حد وحساب سرمایہ داری کو قرآن کے واضح احکام کے برعکس اسلام قرار دے رہے ہیں!

(۳) جنگی قیدیوں کے بارے میں قرآن کا دو ٹوک فیصلہ یہ ہے کہ "یا تو ان کو احساناً چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔" (۴۷/۴)

مگر جماعتِ اسلامی کہتی ہے: "جو لوگ جنگ میں قیدی ہوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا دشمن کے مسلمان قیدیوں کے سے ان کا تبادلہ کر لیا جائے۔ لیکن اگر یونہی رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو اور فدیہ وصول نہ ہو سکے اور دشمن اسیرانِ جنگ کے مبادلہ پر راضی نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انھیں غلام بنا کر رکھیں۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے جنگ میں (گرفتار کردہ عورتوں کو) رہا کرے چاہے ان سے فدیہ لے چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی ان کو اپنے استعمال میں لائیں۔ لونڈیوں سے تمتع کے لیے تعداد کی قید اس لیے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آ سکتی ہیں۔ اس قسم کے لونڈی غلاموں کی خرید و فروخت کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔" (تفہیمات حصہ دوم، ص ۳۹۲، ۳۴۰، ۳۲۳۔ مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

سارے قرآن میں جنگی قیدیوں کے بارے میں صرف مندرجہ بالا آیت آئی ہے جو اپنے مطلب اور مدعا میں بالکل واضح ہے۔ اس کی رُو سے جنگی قیدیوں کو یا تو احساناً چھوڑ دیا جائے گا یا فدیہ لے کر۔ ان دو صورتوں کے ماسوا کوئی تیسری صورت نہیں بتلائی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان صورتوں پر اگر کسی اور صورت کا اضافہ کیا جائے تو وہ قرآن سے لازماً انحراف ہوگا۔ مگر "جماعت اسلامی" کا امیر، جو اس جماعت کا بانی ہے، جماعت اپنے منشور کی رُو سے جس کے جملہ احکام کی پابند ہے اور جس کے لٹریچر اور کتابوں پر اس کا ایمان ہے، جنگی مرد اور عورت قیدیوں کو غلام اور لونڈی بناتا، ان لونڈیوں کو سپاہیوں کے استعمال میں دیتا، ان سے بے قید "تمتع" (زنا) کراتا اور سابق مالکوں کے زنا سے جی بھرنے کی صورت میں ان کو حیوانوں کی طرح کی منڈیاں لگا کر، خرید و فروخت کی کھلی چھٹی دیتا ہے۔ اس صریح انحراف قرآنی کو بھی یہ جماعت عین اسلام قرار دیتی ہے! اب ذرا مرتدین کے معاملے پر نظر ڈالیں:

۴۔ ایسے لوگ جو ایمان لائے، اس کے بعد کافر ہوئے، پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے (اور) اس کے بعد اپنے کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ اللہ ان کو ہرگز معاف نہیں کرے گا اور نہ ان کو راہِ راست کی ہدایت دے گا۔ (۴/۱۳۷)

۴۔ "یہ بات اسلامی قانون کے کسی واقف کار سے پوشیدہ نہیں ہوگی کہ اسلام میں اُس شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔" (مرتد کی سزا ص: ۹ مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

"پس جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے وہ بہرحال یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائے گی اور قانونِ اسلام کی طرف سے اُن کے لیے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھرے گا تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہوگا جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آ کر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔" (تفہیمات حصہ دوم ص ۴۷)

مندرجہ بالا آیت میں خدا کے نزدیک ایک مسلمان کے دو دفعہ کفر اختیار کرنے کے لیے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اگر وہ تیسری دفعہ کفر اختیار کرے گا تو اس کا یہ جرم یا گناہ ناقابلِ معافی ٹھہرے گا اور اس کی سزا یہ ہے کہ وہ ہدایت سے محروم ہوگا۔ مگر اس کی جان لینے یا اس کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس مودودی صاحب ایسے لوگوں کو بھی قتل کرنے کا حکم دیتے ہیں جو اسلام میں داخل ہو کر پھر کافر ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی مسلمان اولاد میں سے کافر ہونے والوں کو بھی قتل کرنے کا فتویٰ دے رہے ہیں! غور فرمائیے کہ ان کے یہ احکام قرآن کے مطابق ہیں یا اس کے برعکس اس کی سراسر ضد ہیں؟ نہ صرف یہ بلکہ جملہ پیدائشی مسلمانوں کی مسلمانی ان کے نزدیک مشکوک ہے اور اس لیے وہ ان کو مندرجہ ذیل نوٹس دیتے ہیں:

"میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے واللہ الموافق للصواب کہ جس علاقے میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیا جائے کہ "جو لوگ اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی میں سے باہر نکل جائیں"۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو، جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا، تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کیے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انھیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اُسے قتل کر دیا جائے گا"۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ ص ۷۵، ۷۶)

آج اگر بدقسمتی سے "جماعت اسلامی" برسرِ اقتدار آ جائے تو یہاں کی تمام مسلمان آبادی مسلمان متصور نہ ہو گی، بلکہ اُس کو غیر مسلم قرار دے کر ایک سال کا نوٹس دیا جائے گا اور اس کے بعد جو لوگ ترکِ وطن نہ کر کے یہاں رہیں گے ان کو بالجبر اُن قوانینِ اسلامی اور فرائض و واجباتِ دینی کے التزام کا پابند ہونا پڑے گا جنھیں یہ جماعت نافذ کرے گی۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو قتل کر دیے جائیں گے۔ ظاہر ہے وہ ساری باتیں ان قوانین میں داخل ہوں گی جن کا اظہار بطورِ قاعدۂ کلیہ مودودی صاحب نے اپنی اُن محولۂ بالا کتابوں میں کیا ہے جن کے اقتباسات سطورِ بالا میں پیش کیے گئے۔ لہٰذا یہاں زمینداری، غلامی، غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت اور غیر مسلم قیدی عورتوں سے زناکاری کو "قوانینِ اسلامی اور فرائض و واجباتِ دینی" کی حیثیت حاصل ہو گی۔ ان ممنوعاتِ قرآنی کو ممنوع ماننے والے اسلام کے منحرف ٹھیریں گے اور ان کی سزا پاکستان سے جبری اخراج اور قتل ہو گی! یہ صرف عہدِ پارینہ کی باتیں نہیں ہیں، بلکہ مودودی صاحب نے ابھی ابھی لندن سے واپسی پر کراچی میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا:-

"جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں سوال یہ ہے کہ انھیں صرف اسلام کہتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے؟ بہرحال نام سوشلزم کا ہو یا اسلامی سوشلزم کا، اسلام کے خلاف اس قسم کی جو تحریک چلائی جائے گی جماعت اسلامی اس کا مقابلہ کرے گی۔ دل خوش کن نعروں اور لیبلوں سے کوئی اور دھوکا کھائے تو کھائے، لیکن جماعت اسلامی دھوکا نہیں کھائے گی۔" (ہفت روزہ آئین مورخہ ۳۱ر دسمبر ۶۸ء ص ۹،۱)

یہ ہے وہ اسلامی نظام جسے "جماعت اسلامی" یہاں نافذ کرے گی! مودودی صاحب کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں دراصل وہ لوگ قتل نہ ہوں گے جو اسلام سے منحرف ہوں گے، بلکہ قتل اُن کو کیا جائے گا جو قرآنِ حکیم کا اتباع کریں گے۔ مودودی صاحب کے فرمودات کے سامنے قرآنِ حکیم کی واضح آیات پیش کی گئی ہیں۔ اُن سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اور خدا اور رسولؐ کے نزدیک زمینداری، سرمایہ داری، غلامی اور "قتلِ مرتد" سراسر ممنوع ہیں۔ مگر مودودی صاحب کے نزدیک یہی مصائب و مظالم اسلام ہیں۔ اور ان کے ان احکام کے نہ ماننے والے اسلام سے منحرف، مرتد، کافر اور واجب القتل ہیں۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ قرآن اور اسلام کو مانیں اور اس کے احکام پر عمل کریں وہ مرتد اور کافر ہوں گے اور جو لوگ مودودی صاحب کے خلافِ قرآن احکام کی تابعداری کر کے عملی کفر کا مرتکب ہو جائیں وہ مسلمان اور اسلامی ریاست کے حاکم ہوں گے! مختصر یہ کہ مودودی صاحب اور ان کی "جماعت اسلامی" کے نزدیک اسلام، کفر ہے اور کفر اسلام ہے!! اِن حالات میں آج اہلِ پاکستان کو ایک بہت بڑے اور بے مثال چیلنج سے مقابلہ درپیش ہے۔ ان کو سوچنا چاہیے کہ اس جماعت کے وجود اور اس کی حمایت کے نتائج کس قدر فتنہ در آغوش، خطرناک اور تباہ کُن ہوں گے؟

کراچی میں نصرت کی سول ایجنسی ختم کر دی گئی ہے
اب کراچی کے تمام نیوز ایجنٹ
براہِ راست پرچہ منگوا سکتے ہیں
جنرل مینجر: ہفت روزہ نصرت (چوک انارکلی، لاہور (فون: ۶۶۶۰۶)

۶/ ستمبر کے عظیم ہیرو
نشانِ حیدر
عزیز بھٹی شہید
پر
ایک عظیم کتاب
از: اصغر علی گھرال
"اُردو کی بہت کم سوانح عمریوں کو اس حد تک مکمل کہا جا سکتا ہے کہ ان کا موضوع ایک ایسے جیتے جاگتے، سانس لیتے کردار کی صورت میں ہمارے قریب آ جائے کہ ہم اس کے دل کی دھڑکن بھی سن سکیں اور اس کے جذبے کی گرمی بھی محسوس کر سکیں۔"
احمد ندیم قاسمی
قیمت: پندرہ روپے
البیان — چوک انارکلی — لاہور

پاکستان پیپلز پارٹی کی ایک اساسی دستاویز

دُوسری جماعتوں کی موجودگی میں

پاکستان پیپلز پارٹی کیوں بنائی گئی

پاکستان اپنی آزاد اور خود مختار زندگی کے تیسرے عشرے میں داخل ہو رہا ہے لیکن بارہ کروڑ پاکستانیوں کے تمام بنیادی مسائل کا حل اور ان کا مستقبل ابھی تک غیر یقینی ہے۔ یہ بات اس لیے بھی زیادہ افسوسناک ہے کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اس برصغیر کے مسلمانوں نے مکمل اعتماد کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی بنیادیں اسلام کے بنیادی اصولوں پر استوار کی جائیں گی اور ہماری سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی اسلام کے دینی اور دُنیوی اصولوں کی قوت سے رواں دواں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ نہ ہو سکا اور اس کے لیے کسی لمبی چوڑی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ مارشل لاء سے پہلے پاکستان اپنی قومی زندگی کے تمام ضروری شعبوں میں بہت ہی پیچیدہ مسائل اور مشکلات میں گھرا ہُوا تھا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کو بے شمار دشواریوں کا سامنا پڑا تھا۔ اسے مخلوط یا غیر مخلوط انتخابات کا نظریہ، مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان صوبائی مساوات کا مسئلہ، دینی اور لادینی سیاسی نظریے کا باہم تعلق، اقلیتوں کے حقوق، مغربی پاکستان کی وحدت کا مسئلہ اور دُوسرے بہت سے ایسے ہی نازک اور آتش گیر مسائل درپیش تھے۔

معاشرے میں رشوت ستانی، نفسا نفسی اور کُنبہ پروری کا اس قدر دور دَورہ تھا کہ ہماری اخلاقی اور سماجی زندگی تیزی سے پستی کی طرف جا رہی تھی۔ لوگوں میں بددلی اور مایوسی پھیل چکی تھی اور حکومت کے نظم و نسق کی اہلیت پر سے اعتماد اُٹھ گیا تھا خصوصاً غریبوں اور محنت کش طبقوں کے حقوق اور اُمنگوں کو جس بے دردی سے نظرانداز کیا گیا۔ اس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ یہ غریب اور محنت کش لوگ ہی تھے جن کے بل بوتے پر معاشی اور اقتصادی میدان میں سرمایہ داروں کے لیے بے انتہا ترقی کے مواقع پیدا ہوتے اور کارخانوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی لیکن ان لوگوں کی ترقی کے لیے جو ہماری آبادی کی اکثریت ہیں مختلف حکومتوں نے کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غریبی اور افلاس ہمارے محنت کش طبقوں کو گھن کی طرح کھانے لگے۔

نوکر شاہی اور حکومت کے اہلکار بجائے اس کے کہ وُہ لوگوں کی بہبود کی طرف متوجہ ہوتے انہوں نے سیاسی کشمکش میں سیاست دانوں کے ساتھ اپنے آپ کو بُری طرح اُلجھا دیا اور سیاست دانوں کے شانہ بشانہ اس آزاد ملک کے خادم بننے کے بجائے اس کے حاکم بن گئے اور یُوں ملک میں غیر یقینی سیاسی ماحول اور بھی نازک حالات سے دوچار ہوگیا۔ ہمارے تمام قومی سیاسی مسائل میں اضطراب کی کیفیت دِن بدن نمایاں ہوتی گئی۔

ملکی نظم و نسق کی کارکردگی کا معیار بجائے اس کے کہ موجُودہ صدی کے بین الاقوامی معیاروں پر پُورا اُترتا دِن بدن تیز رفتاری سے گرتا چلا گیا۔ کاشت کاروں میں بے مقصدی اور مزدُور طبقے میں بے نظمی اور غیر معین راہِ عمل کا احساس جڑیں پکڑنے لگا اور سفید پوش اور تنخواہ دار طبقہ اپنی جائز ضروریات زندگی کے لیے ترسنے لگا۔ خود غرضی اور ذاتی نفع اندوزی ہمارے معاشرے کے رگ و پے میں رچ گئی۔ تعلیم اور نوجوانوں کی بہبُود جو کہ قومی ترقی کے سرچشمے کی حیثیت رکھتے ہیں ہمارے ملک میں رُو بہ زوال ہوگئے۔ تمام قومی ادارے ماسوا عدلیہ اور افواجِ پاکستان کے شدید بحران کا شکار ہو چکے ہیں۔

ہندوستان کے جارحانہ عزائم کی وجہ سے ہمارے ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اس کا بیّن ثبوت وادیٔ کشمیر میں ہندوستان کی کُھلم کُھلا جارحیت تھی جس کا مقصد دراصل پاکستان کے بنیادی، معاشی اور علاقائی حقوق پر غاصبانہ قبضہ تھا۔

یہ تھے وہ حالات جو ۱۹۵۸ء کے مارشل لا، سے پہلے تھے۔ عوام کی امیدیں ایک دفعہ پھر جاگ اُٹھیں۔ عوام نے سوچا کہ ہمارے قومی مسائل اب ایک دردمند ہاتھ سے سُلجھ جائیں گے۔ نئی حکومت نے زرعی اصلاحات سے سیاسی زندگی کی تطہیر کے ذریعے اور اقتصادی اور معاشی زندگی میں نظم و ضبط کی کوشش کر کے کسی حد تک اپنے قیام کا جواز پیدا کیا۔ بنیادی جمہوریتوں کے باعث کچھ نئے ادارے وجُود میں آئے جن سے قومی مسائل کو حل کرنے کی امید دلائی گئی۔ کسی حد تک نظم و نسق میں خرابیوں کو دُور کیا گیا اور رشوت ستانی پر قابُو پانے کی کوشش کی گئی۔

۱۹۶۲ء میں مارشل لاء کے ہٹنے پر ایک حد تک جمہوریت اور مطلق العنانی کا دوغلا نظام رائج کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی تقریباً تمام قومی پریس کو نیشنل پریس ٹرسٹ کی صُورت میں اپنے قبضے میں لے لیا گیا اور دُوسری طرف ایک سیاسی پارٹی قائم کر دی گئی تاکہ وہ ان حالات کا مقابلہ کر سکے درحقیقت جن کا جمہوریت سے انحراف کی وجہ سے

ہفت روزہ نصرت لاہور/ ۱۹ جنوری ۱۹۶۹ء

پیدا ہونے کا امکان تھا۔ یہ پارٹی پہلے تو کنونشن لیگ کہلائی اور بعد میں اس کا نام پاکستان مسلم لیگ رکھ دیا گیا۔

بنیادی جمہوریتوں کے تحت ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء میں انتخابات ہوئے۔ موجودہ حکومت کی نافذ شدہ اصلاحات کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ حکومت اپنی افادیت اور کارکردگی کی اہلیت کو مکمل طور پر کھو بیٹھی ہے۔ اس دورِ حکومت میں بہت سے بنیادی قومی مسائل کا اجاگر ہوا ہے اور نئے مسائل نے سر اٹھایا ہے۔ یہ حکومت ماضی کے کارناموں پر نہیں جی سکتی۔ ماضی کے مقابلے میں اب رشوت ستانی، کنبہ پروری اور دوسری بدعنوانیاں کہیں زیادہ عروج پر ہیں۔ کم سے کم عدلیہ جو مارشل لاء سے پہلے با اختیار تھی مارشل لاء کے بعد کمزور ہو کر رہ گئی ہے۔ اور ہمارے نظامِ قانون میں قانون دان طبقے کی نا رضامندی کے باوجود اس قدر الجھنیں اور بے ضابطگیاں داخل کر دی گئی ہیں کہ عوام جن کے حقوق کی پشت پناہی بالآخر قانون ہی کرتا ہے۔ اس ڈھال سے محروم ہو گئے ہیں۔

جرائم اور تشدد کی وارداتوں میں روز افزوں اضافے نے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ صنعت کاری میں بے مقصد اور محض ذاتی اغراض کے پیشِ نظر افزائش زرعی ترقی کی طرف مجرمانہ عدم توجہ کا باعث بنی ہوئی ہے اور اسکی وجہ سے ایک بہت ہی سنگین معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کے دور رس نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ اس ملک کو خوراک میسر نہیں ہو سکتی جب تک کہ غیر ملکی اناج کی درآمد نہ کی جائے اور یہ غیر ملکی اناج ہمارے زرِ مبادلہ کے ذخائر کو تیزی سے ہضم کرتا جا رہا ہے۔

محنت کش طبقہ سخت ہیجان میں مبتلا ہے۔ غریب اور سفید پوش طبقے کے لیے افراطِ زر اور دن بدن بڑھتی ہوئی قیمتوں کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ نئی نسل اور ہمارا دانش ور طبقہ بے حسی اور بے مقصدیت کا شکار ہو رہے ہیں۔ جھوٹی اور مبتذل اقدارِ زندگی نے ہمارے قومی جذبے اور حوصلے کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ طالب علموں میں اضطراب اور کرب کا احساس تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ عوام میں قومی مسائل سے لاتعلقی کی روش پیدا ہو رہی ہے۔ سول سروس تک کو آئینی حقوق کا پہلا سا تحفظ حاصل نہیں رہا۔

۱۹۶۲ء میں ہندوستان اور چین کی جھڑپ کے بعد پاکستان کی بری، بحری اور ہوائی افواج کی قوت میں جس قدر اضافے کی ضرورت تھی اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی حالانکہ ہندوستان نے اپنی فوجی قوت کو ۱۹۶۲ء کے بعد خطرناک حد تک مضبوط کر لیا تھا۔ یہ سنگین ترین لغزش ناقابلِ معافی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کے جارحانہ حملے کے بعد شروع شروع میں فوجی طاقت کو مضبوط کرنے کی طرف کسی قدر توجہ دی گئی۔ اب بجائے اس کے کہ تمام دوسری ضروریات کو پس پشت ڈال کر فوجوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے اس بات کا چرچا کیا جا رہا ہے کہ دشمن ہندوستان کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سمجھوتہ کر لیا جائے اور فوجوں میں تخفیف کر دی جائے۔ خارجہ معاملات اور خارجہ پالیسی میں تضاد کی وجہ سے دن بدن کھچاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ تضاد کا یہ چکر اب اس حد تک مکمل ہو چکا ہے کہ اس کی وجہ سے ملک کے بین الصوبائی تعلقات میں بھی کشیدگی بڑھ رہی ہے۔

صدارتی اور پارلیمانی طرزِ حکومت، محدود انتخابات اور بالغ رائے دہی کے حق کے سلسلے میں نئے آئینی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ تاشقند کے شرمناک سمجھوتے اور ہندوستان کے ساتھ امن کی عاجزانہ درخواستوں کے باوجود عوام کو اُن کے بنیادی حقوق سے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے عذر لنگ کے تحت غیر معین عرصے کے لیے محروم کر دیا گیا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ قومی زندگی بے مقصد ہو گئی ہے اور قوم کا دم گھٹنے لگا ہے۔

قومی زندگی کو مکمل سیاسی بحران کے عمیق گڑھے کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ وہ سیاست دان جو ابھی ابھی پابندیوں سے آزاد ہو کر سیاسی میدان میں واپس آئے ہیں ان میں سے کچھ نے حکمران پارٹی میں شامل ہو کر حکمران پارٹی کی بے مقصدیت اور بے راہ روی پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ دوسروں نے اپنی اپنی سیاسی پارٹیوں کی دوبارہ تنظیم کر کے ایک متحدہ محاذ بنا لیا ہے کہ شاید وہ اس طرح ملک کے اندرونی اور بیرونی مسائل پر قابو پا لیں گے۔

لحظہ بہ لحظہ اور قدم بہ قدم قومی مسائل کا یہ تدریجی اور ارتقائی عمل ایک واضح صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ مگر ان مختلف سیاسی اور قومی الجھنوں سے سلجھاؤ کی صورت ابھر رہی ہے۔ کوئی بھی ردِ عمل اور تضاد بالآخر مثبت عمل اور امتزاج کی طرف لوٹتا ہے اور اسی طرح سیاسی تبدیلیاں ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ سیاسی عمل ناگزیر ہے۔

ایبڈو کے ہٹنے کے بعد سابق سیاست دان صاف طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک تو وہ جنہوں نے اپنے سابقہ سیاسی مقام اور نظریات سے انحراف کرنا گوارا نہ کیا اور دوسری طرف وہ جنہوں نے صحیح سیاست اور دیانت کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسی حکومت کے دامنِ عاطفت میں پناہ لی جس نے انہیں سیاسی مجرم اور قومی تباہی کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ اس کے بعد کونسل مسلم لیگ اور دوسری سیاسی پارٹیوں نے اپنے اپنے انتخاب کیے۔ گو کچھ پارٹیوں نے

ابھی انتخابات اور دیگر بھی کارروائیوں سے گزرنا ہے۔

مئی ۱۹۶۷ء میں ڈھاکہ میں تحریکِ جمہوریت پاکستان (پی۔ڈی۔ایم) کا وجود کونسل مسلم لیگ، عوامی لیگ، جماعتِ اسلامی اور نظامِ اسلام پارٹی کی شمولیت سے عمل میں آیا۔ تحریکِ جمہوریت پاکستان نے آٹھ نکاتی پروگرام کے تحت پاکستان میں جمہوریت کو بحال کرنے کا تہیہ کیا۔ گو پی ڈی ایم کے وجود میں آنے کے بعد عوامی لیگ کا ایک گروہ اسے چھوڑ چکا ہے اور ابھی یہ تحریک پوری طرح حرکت میں نہیں آئی لیکن پھر بھی یہ ہماری ملکی سیاست کی ارتقائی منزل کی طرف ایک مثبت اقدام ہے۔

جمہوریت کی بحالی کے لیے تمام قدامت پسند سیاسی پارٹیوں کا الحاق نہ صرف موجودہ سیاسی صورتِ حال کو واضح کرتا ہے بلکہ اس سے یہ بھی عیاں ہے کہ ان مختلف قدامت پسند سیاسی پارٹیوں کے اقتصادی اور معاشرتی پروگرام کم و بیش یکساں ہیں۔ پی ڈی ایم چونکہ قدامت پسند رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ اس لیے ترقی پسند عناصر پی ڈی ایم میں شامل سیاسی پارٹیوں سے بہ آسانی اشتراکِ عمل نہ کر سکے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہی وجہ ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی پی ڈی ایم کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ کر سکی اور اسے اپنے سیاسی وجود کو علیحدہ رکھنا پڑا۔

حالات کی رفتار اس بات کی متقاضی ہے کہ اب اس دور کا آغاز ہو جب تمام ترقی پسند عناصر اور سیاسی پارٹیاں مل کر پی۔ڈی۔ایم کی طرح ایک علیحدہ تنظیم قائم کر لیں۔ اس نئی سیاسی صورتِ حال سے یہ خوش آئند تبدیلی پیدا ہوگی کہ ہماری سیاسی پارٹیاں جو کہ پہلے منفی طور پر محض شخصیات کے سہارے پروان چڑھتی تھیں، اب واضح طور پر دو سیاسی رجحانات رکھنے والے یعنی ترقی پسند اور قدامت پسند گروہوں میں بٹ جائیں گی۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ جب قدامت پسند اور ترقی پسند تنظیموں کو اپنا اپنا مقام اور اتحاد حاصل ہو جائے گا تو ان کے لیے آسان ہوگا کہ وہ حقیقی جمہوریت کی بحالی کی بنیاد پر آپس میں سمجھوتہ کر کے ایک قابلِ عمل مشترکہ پروگرام بنا سکیں۔

آنے والے دور میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ ترقی پسند پارٹیاں پی۔ڈی۔ایم کی طرح ایک متحدہ تنظیم بنانے میں کامیاب ہو سکیں گی جس کی وجہ سے قومی سطح پر ایک ایسی فضا ابھرے گی جس میں حزبِ مخالف کی تمام پارٹیاں متحد ہو کر حقیقی جمہوریت کی بحالی کے لیے آئینی جدوجہد کر سکیں گی۔

ان وجوہات کی بنا پر یہ ضروری ہے کہ اپوزیشن جماعتیں آپس میں باہمی سوجھ بوجھ اور تعلقات کی فضا پیدا کریں۔ درحقیقت اپوزیشن پارٹیوں کا نصب العین ایک دوسرے کی نفی اور نکتہ چینی کے بجائے حزبِ مخالف کے تمام عناصر کو اکٹھا کر کے انہیں یک جہتی اور یکسوئی عطا کرنا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حالات میں کیا یہ ضروری تھا کہ ایک نئی سیاسی پارٹی بنائی جائے۔ جب کہ اصل مقصد حزبِ اختلاف کی مختلف پارٹیوں کا اتحاد ہے۔ اگر ذرا غور سے موجودہ سیاسی حالات کا تجزیہ کیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام اس وجہ سے ہی ضروری ہے کہ حزبِ اختلاف کی موجودہ سیاسی پارٹیوں کا اتحاد اس نئی سیاسی پارٹی کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ سیاسی پارٹی ہماری موجودہ سیاسی پارٹیوں کے تاریخی اور سیاسی نظریات کو سلجھانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکے گی کیونکہ یہ کام ہماری نئی سیاسی پارٹی مخلصانہ طور پر، بغیر کسی تعصب یا ذاتی عناد کے، کرے گی۔ موجودہ حالات میں اس لیے بھی ایک نئی پارٹی بے حد ضروری تھی کہ اس کے بغیر ترقی پسند عناصر کو اکٹھا کرنا ممکن نہیں۔

نیشنل عوامی پارٹی بدقسمتی سے تین متحارب گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور ان میں سے خاص طور پر دو گروہوں کے اختلافات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح عوامی لیگ نہ صرف بین الصوبائی اختلافات میں مبتلا ہے بلکہ پی ڈی ایم میں شرکت کے سوال پر اور دیگر اقتصادی اور سماجی مسائل پر بھی متحد نہیں رہی۔ مختلف بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیے گو یہ ناممکن نہیں کہ وہ اپنے اندرونی اختلافات کو درگزر کرتے ہوئے ایک قومی متحدہ محاذ قائم کر سکیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہو گیا ہے کیونکہ ان سیاسی پارٹیوں نے اپنے اپنے تفرقات کو ایک واضح صورت دے دی ہے۔ اس لیے ان میں باہمی اتحاد کا کام ایک نئی سیاسی جماعت ہی کر سکتی ہے جس کی بنیاد ترقی پسند اصولوں پر رکھی گئی ہو۔ عظیم قومی مفاد کے لیے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ اگلا قدم اٹھایا جائے اس لیے گو سطحی طور پر اس بات میں کچھ تضاد نظر آتا ہو کہ نئی پارٹی کا وجود ضروری تھا یا نہیں لیکن دراصل اتحادِ عوام کے لیے ان حالات میں اس سے زیادہ مثبت اور تعمیری اقدام اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

تمام قوم اور تمام ملت اتحاد کے لیے تڑپ رہی ہے۔ حزبِ اختلاف اپنی تمام کوششوں کے باوجود ابھی تک یہ اتحاد قائم نہیں کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتحاد کے لیے محض خواہش ہی کافی نہیں اور اتحاد محض کہنے سے حاصل نہیں ہو جاتا۔ اتحادِ عوام کے لیے ٹھوس کام، قربانیوں اور وسائل کی ضرورت ہے۔ خدا نے چاہا تو پاکستان پیپلز پارٹی یہ کام کر کے دکھائے گی اور اتحادِ عوام کا وسیلہ بنے گی۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس ملک کے عوام کے ایک فعال حصے کا، جس میں ہماری نئی نسل پیش پیش ہے، ایمان ہے کہ قدامت پسندی اور رجعت پرستی سے پاکستان کی عظیم مشکلات کو سر نہیں کیا جا سکتا۔ ہر زمانے کا اپنا سیاسی ماحول اور سیاسی خد و خال ہوتے ہیں۔ موجودہ دور جو کہ نئی امنگوں اور ان سے وابستہ

عمل کی نئی دعوتوں کا آئینہ دار ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک نئی سیاسی پارٹی نئی قوت اور نکھار کے ساتھ پاکستان کے تمام عوام کے لیے ایک ایسے مثالی معاشرے کی تعمیر کا کام سنبھال لے جس کے لیے اس ملک کے عوام نے بے انتہا قربانیاں دی ہیں۔ اب عوام کبھی بھی اس بات پر رضامند نہیں ہو سکتے کہ وہ محض ماضی کی طرف دیکھتے رہیں اور نہ ہی وہ موجودہ حالات کی سنگینی کو اور زیادہ برداشت کر سکتے ہیں۔ عوام چاہتے ہیں کہ عدل و انصاف پر مبنی ایک نیا نظام قائم کیا جائے جس میں ملک کے کروڑوں عوام کے بنیادی حقوق اور مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ یہ کام اور یہ فرض ایک نئی سیاسی جماعت ہی ادا کر سکتی ہے۔ اخلاص کے اس جذبے، اس نئے اندازِ فکر، اس نئے یقین اور نئی امید کے ساتھ ہی اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ ہمارے گوناگوں قومی مسائل کا حل ہماری قومی اقدار اور محنت کش عوام کے مفاد کے مطابق تلاش کیا جا سکے۔

ہمارے اندازِ فکر میں انقلاب آفرین تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ لمبا راستہ اختیار کرنا کوئی خوشگوار کام نہیں جب کہ چھوٹا راستہ موجود ہو لیکن پاکستان کے موجودہ حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ لمبا راستہ اختیار کیا جائے۔ ہمیں تجربے نے یہ بتا دیا ہے کہ جب ایسے مسائل درپیش ہوں جن سے عوام اور ملک کی تقدیر وابستہ ہو تو آسان اور چھوٹا راستہ دراصل منزل سے آشنا نہیں کرتا بلکہ سراب کی نشان دہی کرتا ہے۔

ان سیاسی حقیقتوں کے پیشِ نظر اور عظیم ملی مفادات کے لیے جن کا تجزیہ کیا گیا ہے، یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ ایک نئی سیاسی جماعت اور ایک نیا سیاسی لائحہ عمل اور دستور اس قوم اور ملت کے لیے اشد ضروری ہیں۔ موجودہ حالات میں ایک نئی سیاسی جماعت کی تنظیم اور نشوونما بہت مشکل کام ہے۔ اس سلسلے میں تمام مجبوریوں اور بندشوں کا احتساب ضروری ہے۔ لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود جو اس قدم کو اٹھانے پر پیش آئیں گی، ہماری سیاسی زندگی کی موجودہ حالت اور ہمارا قومی مفاد ہم سے یہی راستہ اختیار کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، چاہے اس کے لیے ہمیں انتہائی قربانی دینی پڑے اور اپنا سب کچھ لٹانا پڑے۔ صرف اسی راستے کو اختیار کرنے سے قومی اتحاد اور حب الوطنی کے مفادات کو تقویت پہنچائی جا سکتی ہے۔

عوام اپنے جذبۂ اخلاص اور یقینِ محکم کے طفیل اس بات کے اہل ہیں کہ وہ حقیقت پسندی سے اپنے تمام مسائل کو خود حل کر سکیں۔ اسی لیے اتحادِ عوام اس نئی سیاسی جماعت کا نصب العین ہے۔

قومی مسائل کو حل کرنے کے لیے مشعلِ راہ ہمارے قائدِ اعظم کے اقوال و ارشادات ہیں اور یہ ہمارے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہیں گے۔ اس ملک کے عوام اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ وہ اس جذبے اور روح کو زندہ کر کے رہیں گے جو ہمیں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے عطا کی تھی۔ ہمارا مقصد نئے مسائل پیدا کرنا نہیں اور نہ پرانے مسائل کو زندہ کرنا ہے۔ بلکہ ان مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو قیامِ پاکستان سے لے کر ہماری سیاسی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔ ملک کی تقدیر کا فیصلہ چند افراد اپنی مرضی سے کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ملک کے تمام عوام اپنے حقیقی نمائندوں کے ذریعے سے ہی، جنہیں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیا گیا ہو، اپنے آئینی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

پاکستان کے عوام سے یہ اپیل باہمی یقین اور اعتماد کی بنا پر کی جاتی ہے اور باہمی یقین اور اعتماد کی بنیاد عدل و مساوات کے اصولوں پر ہی رکھی جا سکتی ہے نہ کہ جبر و استبداد اور لوٹ کھسوٹ کے پرانے مسلک پر۔ اس نئی بنیاد پر پاکستان کے عوام اپنے اندرونی اور بیرونی مسائل کا حل یقینی طور پر تلاش کر سکتے ہیں۔

قادرِ مطلق خدا پر غیر متزلزل ایمان کے ساتھ جو تمام جہانوں اور انسانوں کا پالنے والا ہے، دینِ اسلام کے لیے جذبۂ حمیت رکھتے ہوئے اور پاکستان کے مقاصد کے لیے اپنے آپ کو کلی طور پر وقف کرتے ہوئے ہم سب اللہ کا نام لے کر اس عظیم کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اتحادِ عوام سے اور اجتماعی تدبّر اور سوچ بچار کی بدولت پاکستان کی خدمت میں مگن ہو کر ہم اپنے شاندار مستقبل کی طرف گامزن ہوں گے اور دنیا میں عدل و انصاف اور امن کو قائم کرنے کا موجب بنیں گے۔

مندرجہ ذیل پمفلٹ تیار ہو رہے ہیں
۱۔ پاکستان پیپلز پارٹی کیوں بنائی گئی۔ —— ۲/- روپے فی سینکڑہ
۲۔ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ —— ۲/- " " "
۳۔ نظریۂ پاکستان —— ۵/- روپے فی سینکڑہ
۴۔ قائدِ اعظم کس طرح کا پاکستان چاہتے تھے۔ ۵/- " " "
ایک سو سے کم پمفلٹ نہیں بھیجے جائیں گے۔
—— البیان —— چوک انار کلی —— لاہور

ستم زدگانِ جہاں

الجزائر میں سامراجی مظالم کی دلدوز کہانی

اور

الجزائری عوام کی جدوجہد آزادی کی داستان

تصنیف: فرانز فینن

ترجمہ: محمد پرویز

نظرثانی: سجّاد باقر رضوی

نگارشات

۱۷۶/ انارکلی ـــــ لاہور

ایک آواز ـــ ایک آدرش ـــ ایک پیغام
پاکستان کی عظیم شخصیت پر ایک عظیم کتاب

ذُوالفقار علی بھٹو
شخصیّت اور کردار

ایک تاریخی دور کی تاریخی روداد ... قیمت ۳/۵۰

بھٹو ـــ تصاویر کے آئینے میں

چیئرمین بھٹو کی تاریخی تصاویر کا البم
زندگی کے ہر دور کی تصاویر۔ آرٹ پیپر پر خوبصورت آفسٹ طباعت

قیمت ۲/۰۰

مکتبۂ عالیہ۔ ایبک روڈ۔ لاہور

اِن کتابوں کا مطالعہ آپ کو صحیح سیاسی اور سماجی شعور عطا کرے گا

سوویت یونین میں اسلام ـــــ ۱/۵۰
قومی آزادی کی تحریک کا حقیقی معاون ـــــ ۱/۵۰
گناہ اور سائنس ـــــ ۴/-
کمیونسٹ مینی فیسٹو ـــــ ۱/۵۰
اقوام مشرق کی تحریک آزادی ـــــ ۲/۵۰
مارکسی سیاسی معیشت کے بنیادی اصول ـــــ ۳/۰۰
آج کا سوویت یونین ـــــ ۲/۰۰
روس میں سوشلزم کی تعمیر ـــــ ۲/۰۰
کمیونزم کیا ہے ـــــ ۲/۰۰
میری سرگزشت ـــــ ۱/۰۰

سماج کا ارتقاء ـــــ ۳/۵۰
مارکسی فلسفہ ـــــ ۰/۷۵
عالمی مزدور تحریک ـــــ ۴/۵۰
مارکسزم کیا ہے ـــــ ۱/۵۰
انقلاب اکتوبر (تقریریں اور مضامین) ـــــ ۰/۷۵
امن کے مسائل ـــــ ۱/۲۵
پرامن بقائے باہم ـــــ ۱/۵
مولانا مودودی کے تصورات ـــــ ۲/۰۰
جدید نوآبادیاتی نظام ـــــ ۳/۰۰

ایک کارڈ لکھ کر مکمل فہرست مفت حاصل کریں

پیپلز پبلشنگ ہاؤس، لاہور

۱۳۔ الینار مارکٹ، چوک انارکلی لاہور ـــــ ۲۶۔ شاہراہ قائد اعظم لاہور
تار: القرطاس
فون: 4512

ہفت روزہ نصرت لاہور — رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۴۸۷
صدر دفتر: چوک انار کلی، لاہور — فون : 66606
محمد حنیف رامے نے شیخ حامد محمود کے زیرِ اہتمام نوائے وقت پرنٹرز لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

میرے لیے باعث فخر ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو انڈونیشیا اور پاکستان کے درمیان دوستی کے ضمن میں عظیم خدمات انجام دینے پر اپنے ملک کا اعلیٰ ترین اعزاز ۔ آرڈر آف انڈونیشیا ۔ پیش کر رہا ہوں مسٹر بھٹو آزادی کے عظیم سپاہی اور افریشیائی اتحاد کے عظیم کارکن ہیں

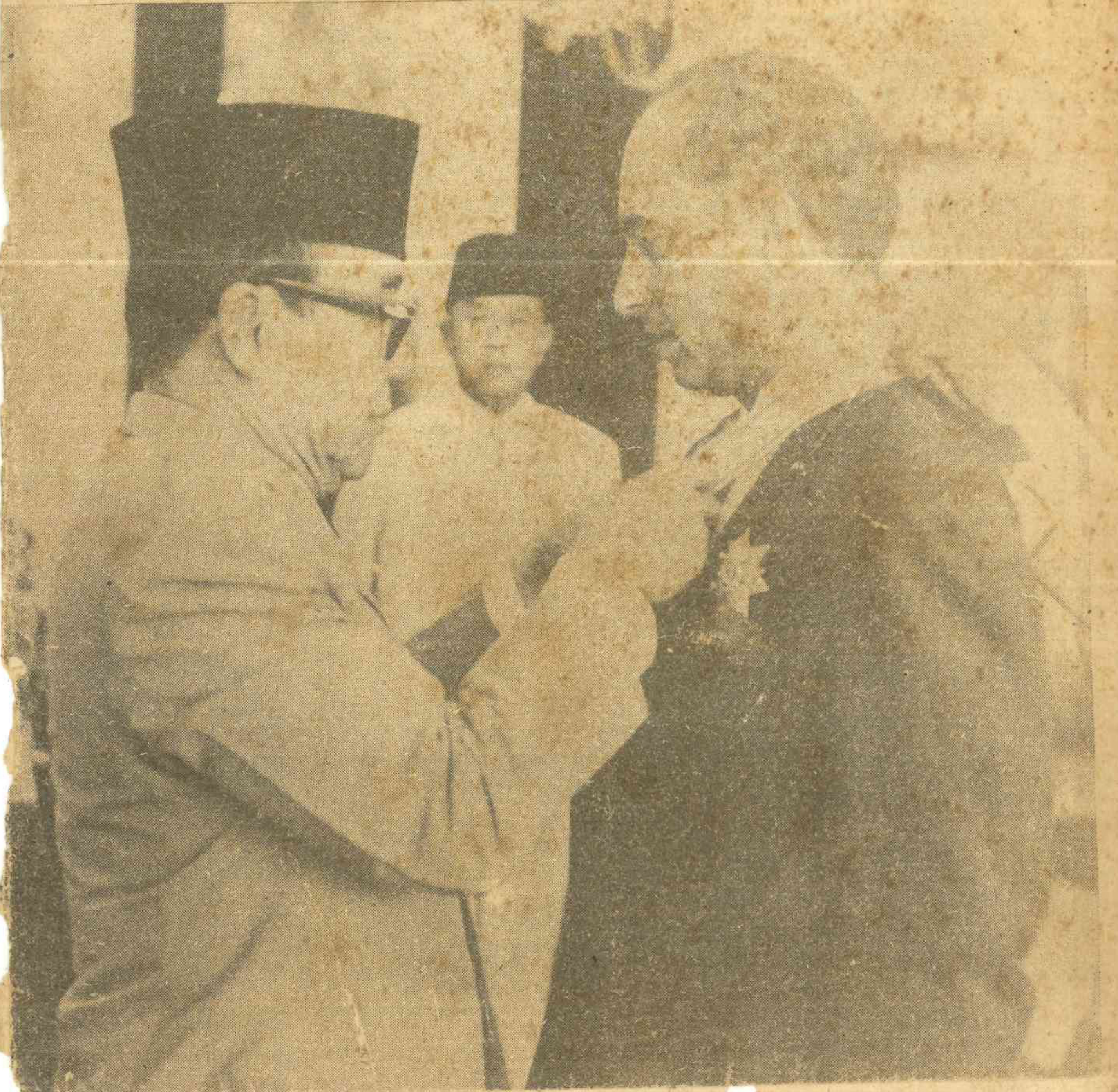صدر سوئیکارنو ۔ ۲۰/اپریل ۱۹۶۵ء